قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھترواں سال

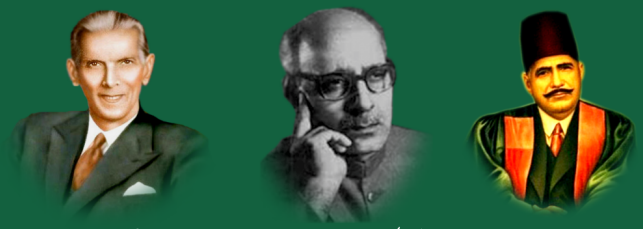
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اگست 2021ء

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

طلوعِ اسلام قارئین کو جشنِ آزادی مبارک

سوات میں منعقدہ ایک تقریب کی تصویری جھلکیاں

منعقدہ 9 جولائی 2021ء











بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اگست 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 8

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: 14 اگست، پاکستان اور Quranocracy	ادارہ	4
کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟	پرویزؒ	7
سوات میں پرویز صاحب کے یومِ پیدائش پر ایک تقریب کا احوال	خورشید انور، سوات	18
اسوۂ حسنہ (مسلسل)	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ	22
بچوں کا صفحہ: پرویزؒ کا پیغام بچوں کے نام	محمد ارشد، سلیم اختر	32
مسلمانوں کے زوال میں پرستش کا کردار	خواجہ ازہر عباس، کراچی	35
دوقومی نظریہ پاکستان والی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	42

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Is Sexual Relationship a Private Matter? 61

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

14 اگست، پاکستان اور QURANOCRACY

برحق کہ قائداعظم پاکستان کو ایک مذہبی یا تھیوکریٹک ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے اور یہ بات انہوں نے قیام پاکستان کے ابتداء کے دنوں ہی میں کہہ دی تھی' فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام پیغام میں انہوں نے فرمایا تھا۔ ''یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ خدائی مشن کو پورا کریں''۔ مگر وہ اسے سیکولر ریاست بھی بنانا نہیں چاہتے تھے۔ سیکولرازم کے دعویدار تو گاندھی اور جواہر لال کی کانگریس بھی تھی جس کے صدر تحریک پاکستان کے دور میں ابوالکلام آزاد تھے جنہیں امام الہند کا لقب بھی حاصل تھا۔

حامیان تحریک کا سارا زور بھی ایک طرف ہندو کے تعصب' عدم رواداری' مسلم دشمنی اور دوسری طرف مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی' تعلیم میں پسماندگی رہا ہے' اس طرح سے اسے علیحدگی کی ایک مذہبی تحریک کا رنگ دے دیا گیا۔ ماڈرن' بزعم خود روشن خیال' پروگریسو طبقے نے اسے مسلمانوں کی تحریک خود ارادیت کا نام دے دیا۔ آیئے ذرا اس پر نگاہ ڈالیں کہ اصل بات کیا تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ جس کا سارے فسانے میں کوئی ذکر نہ تھا وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے۔

دراصل ہمارے ذرائع ابلاغ۔ جیسے کیسے بھی یہ رہے ہیں۔ اس کے کرتا دھرتا قیام پاکستان کی اصل و بنیاد سے اکثر و بیشتر ناواقف رہے ہیں' حامیان تحریک کا سارا زور بھی ایک طرف ہندو کے تعصب' عدم رواداری' مسلم دشمنی اور دوسری طرف مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی' تعلیم میں پسماندگی رہا ہے' اس طرح سے اسے علیحدگی کی ایک مذہبی تحریک کا رنگ دے دیا گیا۔ ماڈرن' بزعم خود روشن خیال' پروگریسو طبقے نے اسے مسلمانوں کی تحریک خود ارادیت کا نام دے دیا۔ آیئے ذرا اس پر نگاہ ڈالیں کہ اصل بات کیا تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ جس کا سارے فسانے میں کوئی ذکر نہ تھا وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے۔

1940ء میں جب لاہور ریزولیوشن پاس ہوا اور 40ء سے 47ء تک ذرا مخالفت میں کھڑے لوگوں کا جائزہ لیا جائے تو بات ذرا نکھر کر سامنے آ جائے گی۔

ہندو کی مخالفت قدرتی بات تھی' بھارت ماتا کی تقسیم گئو ہتھیا ہی کی طرح نا قابل قبول تھی اور پھر مغربی طرز جمہوریت میں انہیں مسلمان اقلیت پہ سدا کی حکمرانی کی نوید تھی اور انا کی تسکین بھی کہ جن بیرونی حملہ آوروں نے ہزاروں برس کی تاریخ میں اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھا' چاہے وہ حکمران رہے ہوں یا دوسری قوموں کے ساتھ مشترک محکوم۔ ان کو آخر کار زیر کر سکیں گے۔

انگریز کے لئے اس کی مخالفت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ صدیوں سے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ملک کو انہوں نے اپنی تنظیمی قابلیت کے بل پہ بظاہر ایک ملک بنایا ان کے جاتے ہی پھر سے تقسیم ہو جائے اور کوئی حصہ مغربی تصور جمہوریت سے مختلف نظام حکومت کو اپنا آئیڈیل قرار دے اور انگریز کو چیلنج کرتا ہوا الگ ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ نڈھال برطانوی سامراج کے لئے یہ بہت بڑی شکست تھی' مگر مقابل میں آہنی ارادوں اور اٹل یقین و ایمان کے حامل ایک قائد کی قیادت میں اس وقت کی دس کروڑ کی ایک متحد قوم سیسہ پلائی دیوار بن چکی تھی۔ قائد کی شخصیت بقول ماؤنٹ بیٹن برف کی ایک سل تھی جس پہ بیرونی دباؤ بے معنی تھا' جس کی ناں کو ہاں میں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی تھی۔ مگر مخالفت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس لڑائی میں ایک اور فریق بھی تھا اور یہ تھے کانگریس اور متحدہ ہندوستان کے وہ حامی مسلمان جو مذہبی جماعتوں کا لیبل ماتھوں پہ سجائے قائد کی مخالفت میں سرگرم تھے' اس کے مغربی لباس' مغربی تعلیم' مغربی رہن سہن کو ہدفِ تنقید بناتے تھے۔ خود کو مذہب کے علمبردار اور دینیات پہ اتھارٹی کہتے تھے' یہ نیشنلسٹ مسلمان ابوالکلام' عبدالغفار' آصف علی' سید محمود' کے روپ میں تھے' یہ احرار کے روپ میں بھی تھے' انصار کی شکل میں بھی اور جماعت اسلامی کے رنگ میں بھی۔ ان سب کا کہنا تھا کہ ہم سے زیادہ مسلمانوں کا ہمدرد کون ہو سکتا ہے اور اسلام کے تقاضے ہم سے زیادہ کون جانتا ہے۔ سیدھے سادھے مسلمان عوام پہ ان کے تقدس کا رعب بھی تھا مگر ادھر لاکھ مولانا سہی ادھر ایک ہی مردِ مجاہد' ایک قلندر:

فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا　　قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

وہ کہتے تھے متحدہ ہندوستان میں کانگریس ہمیں مذہبی شعائر کی' رسومات کی' نماز' روزے کی' زکوٰۃ و حج کی' نکاح و طلاق کے نجی معاملات کی ضمانت دیتی ہے ہمیں اور کیا چاہئے۔

غور کیجئے تو اس طرح سے ان کی چودھراہٹ ہی نہیں معاملات پہ خصوصی گرفت کو دوام حاصل ہوتا۔ دوسری طرف قائداعظم تھے جو ہر موقعہ پر قرآن پاک کی بالادستی کے علمبردار تھے۔ مولانا حضرات کی طرح اتھارٹی ہونے کے دعویدار نہ تھے' خود ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں اعتراف کیا کہ ''میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملانہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کی اپنے طور پر کوشش کی ہے' اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔۔''

اوراس مطالعے اورغور وفکر نے اس غیر معمولی ذہین شخص کو کیا بصیرت بخش دی' کن دوٹوک لفظوں میں اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت پیش کی۔ فرمایا ''اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی' قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں' اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے''۔ اور یہ کہہ کر قیام پاکستان کا جواز دیا کہ ''حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے''۔ قائداعظمؒ جیت گئے' پاکستان بن گیا۔ مخالف اسے تسلیم کرنے پہ مجبور تو ہوئے مگر اندر ہی اندر چوٹ کھائے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے رہے' انگلستان کی پارلیمان میں آواز سنی گئی کہ یہ تقسیم عارضی ہوگی اور سیکولرازم کے دعویدار نہرو نے بھی کہا کہ ہم معاشری طور پر یا دوسرے طریقوں سے پاکستان کو مجبور کر دیں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل آ کر ہم سے درخواست کرے۔۔۔۔ اور مذہب کے یہ علمبردار بھی جوق در جوق اسی ملک میں پناہ گیر ہوئے جسے وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کا درجہ دیتے تھے۔ اور پھر مسلسل ومتواتر ہر حکومت کو گردن زدنی قرار دیتے رہے کہ وہ یہاں پہ شریعت نافذ نہیں کرتی۔ مطلب یہ کہ اقتدار ہمیں دو کہ ہم ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ یعنی تھیا کریسی مذہبی پیشوائیت کی حکومت..... اور فرقوں میں بٹی اس مذہبی پیشوائیت کو ایک ڈکٹیٹر نے اپنی حکومت کو قائم رکھنے کے لئے ڈھیل دی' مراعات دیں' کسی حد تک شریک اقتدار کیا تو ملک فرقہ بازی اور انتشار اور باہمی جدال وقتال کا شکار ہو کر رہ گیا' امن وامان' چین سکون ملک سے رخصت ہو گئے۔

> دوسری طرف قائداعظم تھے جو ہر موقعہ پر قرآن پاک کی بالادستی کے علمبردار تھے۔ مولانا حضرات کی طرح اتھارٹی ہونے کے دعویدار نہ تھے' خود 1941ء میں حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں اعتراف کیا کہ ''میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے' اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔۔''

یہ لوگ اب بھی یہی راگ الاپ رہے ہیں' ضرورت ہے کہ ہم قائداعظم کے خیالات کو' ان کی تقاریر کو اپنے سامنے رکھیں وہ نہ تھیا کریسی کے حق میں تھے نہ ہی مغربی سیکولریت کے' وہ قرآنی مملکت کے داعی تھے۔

مرحوم ڈاکٹر سید عبدالودود نے اس نظام حکومت کے لئے ایک نیا لفظ لغت کو دیا تھا' ضرورت ہے کہ اسے دہرایا جائے کہ وہ قاطع ہے ہر طاغوتی نظام کا۔ خواہ وہ شہنشاہیت ہو (ملوکیت) کمیونزم ہو یا مغربی پارلیمانی جمہوریت۔ اور وہ لفظ ہے قرآنوکریسی (Quranocracy)۔ قرآن میں دیئے گئے تصورات (معاشی' معاشرتی' سیاسی) کی روشنی میں' اس کی ابدی اقدار کی پابند حکومت کہ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

(سردار شوکت حیات کو غلط فہمی ہوئی ہے)

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی کا آخری مضمون جو پریس میڈیا میں شائع ہوا

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اپنی نہایت کمزور صحت کے باوجود 25 اپریل 1984ء کو 25 بی گلبرگ 2، لاہور میں روزنامہ جنگ لاہور کے نمائندگان جناب ضیا شاہد صاحب، جناب اسد اللہ غالب صاحب اور جناب ارشاد عارف صاحب کو انٹرویو دیا جس کی ویڈیو بھی ادارہ طلوع اسلام کے پاس دستیاب ہے۔ روزنامہ جنگ لاہور نے 4 مئی 1984ء کے جمعہ میگزین میں جناب پرویزؒ کے انٹرویو میں دیئے گئے جوابات پر مشتمل مضمون کی صورت میں شائع کیا۔ چونکہ یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ اور جناب پرویزؒ کا پریس میڈیا میں شائع ہونے والا آخری مضمون ہے اور آج بھی نہایت تازہ حالات کی روشنی میں پاکستانیوں کی خصوصاً اور عوام الناس کی عموماً راہنمائی کے لئے بہت ضروری معلومات کا حامل ہے، اس لئے بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور اس مضمون کو دوبارہ ماہنامہ طلوع اسلام کی زینت بنایا جا رہا ہے۔

روزنامہ جنگ (لاہور) کے جمعہ میگزین ایڈیشن (بابت 13 الغایت، 19 اپریل 1984ء) میں سردار شوکت حیات کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے (ملخصاً) کہا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بلکہ سیکولر فلاحی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اس کی تائید میں انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں جو سردار شوکت حیات نے کہی ہو۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے شوشے چھوڑے جاتے رہے ہیں۔ مدون طور پر اسے جسٹس محمد منیر (مرحوم) نے

> قائداعظمؒ کے ساتھ اس قرب کی بنا پر مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ وہ کس قسم کا اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا وہ میرے ذاتی علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ کسی کا ذاتی علم تاریخی سند قرار نہیں پا سکتا۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائداعظمؒ کے ان بیانات اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں

اپنی کتاب From Jinnah To Zia میں چھوڑا تھا جس کا تفصیلی جواب میں نے اپنے ایک مقالہ میں دیا تھا۔

چونکہ سردار شوکت حیات نے اپنے انٹرویو میں وہی اعتراضات دہرائے ہیں جنہیں جسٹس (مرحوم) نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مذکورہ صدر مقالہ کی اشاعت اس کوشش کو ناکام بنانے میں موثر ثابت ہوگی جو تاریخ کو مسخ کرنے اور قائداعظمؒ کے خلاف الزام تراشنے کے لئے کی جارہی ہے۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائداعظمؒ کے ضمن میں بالخصوص، جو کچھ میں کہتا چلا آرہا ہوں اور کہوں گا، وہ شنید نہیں، دید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) 1930ء کا پاکستانی ہوں۔ جب علامہ اقبال نے (الٰہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائداعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوع اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

> ''تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں، جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کرلیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔

قائداعظمؒ کے ساتھ اس قرب کی بنا پر مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ وہ کس قسم کا اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا وہ میرے ذاتی علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ کسی کا ذاتی علم تاریخی سند قرار نہیں پا سکتا۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائداعظمؒ کے ان بیانات اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں عام طور پر یہ مغالطہ پیدا کیا جاتا ہے کہ چونکہ قائداعظمؒ تھیاکریسی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے، بڑی رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اسی طرح خلاف اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے، اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں، اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیت گورنر جنرل، فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا۔۔۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدت انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں' ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیا کریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص65)

تھیا کریسی کی مخالفت:

اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تھیا کریسی وہ نظام حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ قائداعظمؒ اس طرز حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا۔

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں تھیا کریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف۔ اس لئے کہ تھیا کریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تھیا کریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا' اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی 23 مارچ 1932ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری' ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں' جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی' سیاسی' بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تا کہ وہ پھر نئی آرزوؤں' نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا

اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ''اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ..... حسبنا کتاب اللہ..... ''ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔''

(خطبات اقبالؒ)

قائداعظمؒ نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ:

''مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خودغرضی کا، مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔''

(تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول، ص48)

> وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائداعظمؒ اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔

اس سے ان کی مراد تھیاکریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر جناح، شائع کردہ شیخ محمد اشرف، جلد دوم، ص386)

اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات:

وہ تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسلامک سٹیٹ کے اصول ومعانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (میں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کو 1941ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی..... انہوں نے فرمایا تھا:

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا

کی ذات ہے جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 جنوری 1942ء، جلد 16 بروز پنج شنبہ، 20 ذوالحجہ 1360 ہجری)

مطالبہ پاکستان کا مقصد:

وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائداعظمؒ اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔۔۔ قائداعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا۔۔۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو، وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز 5-9-1938)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:

حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔ (ہندوستان ٹائمز 14-11-1939)

1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز، 9-6-1940)

اسی رو میں مسٹر گاندھی نے 1946ء میں لکھا تھا:

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن، 9-12-1946)

مسٹر گاندھی کا یہ ردعمل، قائداعظمؒ کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اول الذکر کو یکم جنوری 1940ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا:

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے، لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا، مذہب اور سیاست، دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے، جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم

> قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآن عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا، وہ پوری تحریک پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔

رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں۔ محض غوطہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر جناح، جلد اول، ص 140-139)

قرآن مجید کی عظمت:

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآن عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا، وہ پوری تحریک پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل 1943ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم۔ (تقاریر، جلد اول، ص 516)

13 نومبر 1939ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد برپا ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟ (تقاریر، جلد اول، ص 108)

دسمبر 1943ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی سوال اٹھایا۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا!

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی عظیم کتاب، قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی..... ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول ﷺ، فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر، جلد دوم، ص 50)

انہوں نے 1945ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی..... آپ نے فرمایا:

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریر ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ اس سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔ (تقاریر، جلد دوم، ص300)

اوائل 1977ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قائداعظمؒ کے جشن صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر، پروفیسر ڈاکٹر کراہنن (Krahnan) نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:

قائداعظم محمد علیؒ کے سامنے ماڈل، قرآن مجید تھا۔

(پاکستان ٹائمز، 3 فروری 1977ء)

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس میں جب طلبہ نے یہ سوال کیا کہ ''مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:

جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام

کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے' اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت' ہندو نے بھی کی تھی اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سرفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان کی وجہِ مخالفت سامنے آجائے تو اس سے بھی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شدومد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہوگیا کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

دشمنوں کی گواہی:

یکم نومبر 1941ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرز حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے' مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطہ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون' 2-11-1941)

ضمناً' اوائل 1977ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قائداعظمؒ کے جشن صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر' پروفیسر ڈاکٹر کراہنن (Krahnan) نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:

> قائداعظم محمد علیؒ کے سامنے ماڈل' قرآن مجید تھا۔ (پاکستان ٹائمز' 3 فروری 1977ء)

یعنی بھارت کے مسٹر منشی اور جرمنی کے سکالر تک تو جانتے تھے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب!

بوٹا بوٹا' پتہ پتہ' حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے' گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد' ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا:

> پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا:

> اگر کشمیر کا مسئلہ پرامن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائداعظمؒ اور مخالفین میں باعث نزاع کیا مسئلہ تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کرے گا۔

> "یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔" (مولانا آزاد)

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت' ہندو نے بھی کی تھی اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سرفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان کی بناء مخالفت سامنے آ جائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟ یہ مخالف علماء باستثناء چند' دارالعلوم دیوبند کے مسلک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسلک کیا تھا' اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی سترہ اپریل 1963ء کی

اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:

> یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ مقالہ ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ حضرات سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائداعظمؒ اس طرز حکومت کے مخالف اور یہی ان دونوں میں بنا مخاصمت تھی' سیکولر نظام حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہل مذہب کو اعتقادات' عبادات' رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو اور امور مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے داعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل' دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمیعت العلمائے ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے.....ان کا ارشاد تھا:

> ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سب شامل ہوں' حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہئے' ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام میں اس آزادی کی اجازت ہے۔ (زمزم' مورخہ 7 جولائی 1938ء)

وہ فرماتے تھے:

> کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔ (مولانا مدنی کا پمفلٹ' متحدہ قومیت اور اسلام' ص 61)

اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں' قائداعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام میں مملکت کی بنیاد مذہب (دین) پر ہوتی ہے' اس لئے ان علماء کا یہ مسلک اسلام کے خلاف ہے' بقول علامہ اقبالؒ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قائداعظمؒ اور ان علماء کے اختلاف کی شدت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دے دیا تھا۔ اس فتویٰ کا جواب (مولانا) شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا۔

(''رہبر دکن'' 19 اکتوبر 1945ء) (جاری ہے)

خورشید انور
چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور

سوات میں پرویز صاحب کے یومِ پیدائش پر ایک تقریب کا احوال

9 جولائی کو ملک وملت کے ایک عظیم محسن، مفکر، مدبر و مبلغِ قرآنِ کریم، تحریک پاکستان کے ہراول دستے کے مجاہد اور ایک عہد ساز شخصیت محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ کی سالگرہ کے دن ادارہ طلوع اسلام لاہور سے آئے ہوئے مہمانوں کے اعزاز میں ایک قرآنی محفل فتح پور سوات میں منعقد کی گئی۔ جس میں حلقہ احباب طلوع اسلام کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز پر علامہ پرویزؒ کے انٹرویو سے 15۔16 منٹ کا ایک کلپ پیش کیا گیا جس میں باباجی سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی اتنی زیادہ مخالفت کیوں ہے اور آپ کے پاس قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے کون کون سے ذرائع ہیں؟ باباجی فرما رہے ہیں کہ مخالفت میری نہیں پیغام قرآنی کی ہو رہی ہے جو موت کا پیغام ہے ہر نوع غلامی کے لئے۔ اور جس میں زمانے کے ہر فرعون، قارون اور ہامان یعنی گروہ مترفین، جو دوسروں کی محنت کے ماحصل کو غصب کر کے عیش وعشرت کی زندگیاں گزار رہے ہیں، کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قرآنِ خالص کی یہ صرف ایک ہی آواز ہے اگر اس آواز کو عوام الناس تک پہنچنے سے روکا جائے تو پھر ان کے لئے اور کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ تحریک پاکستان کے مخالف علماء کے خلاف بھی یہی ایک ہی آواز تھی جو ان علماء کے اعتراضات کے جواب میں قرآنِ کریم کی روشنی میں ماہنامہ طلوع اسلام میں تحریر کی صورت میں اٹھتی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور نصرت سے وہاں یہ پاکستان مخالف علماء جنگ ہار گئے اور پاکستان بن گیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ابھی تک یہ علماء ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ یہاں پر قرآنی نظام کا قیام عمل میں نہ آئے، مگر قرآنی دلائل کا سامنا کرنے سے تو گھبرا رہے ہیں اور جھوٹے الزامات اور پروپیگنڈے کا سہارا لے کر مجھے (پرویز صاحب کو) بدنام کرنے

> وہ جانتے ہیں کہ قرآنِ خالص کی یہ صرف ایک ہی آواز ہے اگر اس آواز کو عوام الناس تک پہنچنے سے روکا جائے تو پھر ان کے لئے اور کوئی خطرہ نہیں۔

کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کیونکہ ان میں سے بعض نے جھوٹ بولنے کو نہ صرف جائز بلکہ زندگی کی بعض عملی ضروریات میں واجب ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اور ذرائع ان کے پاس کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی زیادہ ہیں، کیونکہ ملک کے ہر محلے میں مساجد ہیں، لوگ پانچ وقت اس میں آتے ہیں اور کسی دوسرے کو نہ پوچھنے کی اجازت ہوتی ہے نہ بات کرنے کی اور یہاں سے جب کسی کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو ملک کے کونے کونے میں پھیل جاتی ہے۔ اور پھر نہ کوئی تحقیق کرتا ہے اور نہ تصدیق مانگتا ہے، بلکہ الزام کو آگے سے آگے پھیلاتا رہتا ہے۔ باقی رہا میرے ذرائع، تو میرے ذرائع کیا ہو سکتے ہیں۔ صرف میری پنشن ہے اور ادارہ طلوع اسلام کے شائع کردہ لٹریچر کی فروخت سے جو آمدن ملتی ہے وہ۔ اور پیغام میرا ان ہی لٹریچر اور ٹیپ کردہ کیسٹس کے ذریعے جاتا ہے۔ میرا ساتھ دینے والا وہی ہو سکتا ہے جو بڑے دل گردے کا مالک ہو اور پیغام قرآنی کو عام کرنا جن کے دل کی آرزو اور تمنا ہو۔ باقی اپنے متعلق میں اس سے زیادہ کیا بتاؤں کہ۔۔۔۔۔۔۔

> کائنات سے متعلق علم انسان اپنی سائنسی تحقیق سے حاصل کر سکتا ہے البتہ اس تحقیق و تسخیر سے انسان کو جو ثمرات اور فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کو تمام نوعِ انسان میں کیسے تقسیم کرنا ہے اس کے لئے قرآن کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں دے سکتا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے اَبلہِ مسجد ہُوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس کے بعد مقررین نے سامعین کو بتایا کہ قرآن کریم کا مخاطب انسان ہے اور انسان کے معاشی، معاشرتی بلکہ زندگی کے تمام سلگتے مسائل کو زیر بحث لاتے ہوئے یہ ان کے حل کے لئے اصول و قوانین فراہم کرتا ہے۔

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف ِشیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

قرآنِ کریم کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ عیسائیت، یہودیت، ہندومت یا کسی اور مذہبی فرقے کے ساتھ کرایا جائے۔ قرآنِ کریم ہے ایک نظامِ معاشرت و معیشت، اس کا مقابلہ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ ہے جو کہ اس وقت پوری زمین (Globe) کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ قرآنِ کریم نہ ہی کوئی فزکس یا کیمسٹری کی کتاب

ہے۔ کائنات سے متعلق علم انسان اپنی سائنسی تحقیق سے حاصل کرسکتا ہے البتہ اس تحقیق و تسخیر سے انسان کو جو ثمرات اور فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کو تمام نوعِ انسان میں کیسے تقسیم کرنا ہے اس کے لئے قرآن کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں دے سکتا۔ جہاں پر ایک انسان کا مفاد دوسرے سے ٹکرا جائے اس کا فیصلہ سوائے وحی الٰہی کے کوئی نہیں کرسکتا۔ اس لئے کارکنانِ طلوعِ اسلام کو چاہئے کہ مذہبی انداز کے موضوعات کی بجائے ہمیشہ قرآن کے معاشرتی، معاشی نظام کے قیام کی بات کریں اور مذہبی انداز کے مناظروں سے ہمیشہ دور رہیں کہ یہ آپ کو حقیقی موضوع سے ہٹا کر Non issues میں الجھانے کا باعث بنتے ہیں۔

قرآن کریم کے مطابق کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے، خواہ اسے ضابطہ قوانین، قوتِ فیصلہ اور نبوت تک بھی کیوں نہ دے دی گئی ہو (3:78)۔ حکومت (لوگوں میں فیصلہ کرنے اور اپنے فیصلے منوانے) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے (12:40)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ حکومت، اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوتی ہے (6:115)۔ لیکن قرآن کریم کے فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت لاینفک ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہا جاتا ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا۔ الدین، اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنی مملکت کے اندر قائم ہوسکتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ جو ایسا نہیں کرتے، قرآن کریم انہیں کافر کہتا ہے (5:44)۔ بانیان پاکستان نے اس ملک کو اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا کہ یہاں پر قرآنی نظام کا قیام عمل میں لایا جائے گا، مگر ان سے زندگی نے وفا نہ کی اور بعد میں اقتدار پر براجمان ہونے والوں نے اس عظیم مقصد کو فراموش کر کے اپنے ذاتی مفادات کو ہی نصب العین بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام تو خیر دور کی بات ہے یہاں پر ابھی تک انسانی فلاحی نظام بھی قائم نہیں کیا جاسکا۔ بلکہ الٹا یہاں پر بدترین سرمایہ دارانہ نظام اپنایا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اکثریت ایک وقت کی روٹی کے لیے ترس رہی ہے۔ تعلیم و تربیت سے محروم غریب عوام اپنے بچوں اور گردوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ تذلیل انسانیت جیسا جرمِ عظیم معاشرہ میں روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ حزب اقتدار، اقتدار کے مزے لوٹنے اور حزب اختلاف اقتدار کی رسہ کشی

تعلیم و تربیت سے محروم غریب عوام اپنے بچوں اور گردوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ تذلیل انسانیت جیسا جرمِ عظیم معاشرہ میں روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ حزب اقتدار، اقتدار کے مزے لوٹنے اور حزب اختلاف اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف ہے۔ مذہبی پیشوائیت عوام الناس کو جہالت کے عمیق اندھیرے غاروں میں دھکیلنے کی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہے۔

میں مصروف ہے۔ مذہبی پیشوائیت عوام الناس کو جہالت کے عمیق اندھیرے غاروں میں دھکیلنے کی ذمہ داریاں پوری کررہی ہے۔ اس ظالمانہ اور طبقاتی نظام کی وجہ سے آدھا پاکستان ہم کھو چکے ہیں اور باقی خاکم بدہن تباہی کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرآنی نظام ربوبیت کے قیام کے لئے ہمارے اوپر کتنی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جس سے تمام انسانوں کو وسائل رزق تک یکساں رسائی اور تعلیم وتربیت کے یکساں مواقع میسر ہوجائیں گے۔ لہٰذا آج سے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلا کام خود احتسابی اور ابلاغ کا ہے۔ اور اسے تمام دیگر کاموں پر فوقیت دینا ہے ورنہ جیسا کہ قرآن کریم کی سورۃ التوبہ کی، آیت 24 میں ارشاد مبارک ہے تباہی ہماری منتظر ہے۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ مفہوم: (اے رسول!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہل خاندان اور مال و دولت جو تم کماتے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس (کے قیام و بقا) کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ عزیز ہے، تو پھر (تم اپنی اس رَوش کے نتائج کا) انتظار کرو، تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے، اس کے ظہور نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جائے۔ یقین جانئے کہ اگر ہم اس مقدس فریضے کو اولیت دیکر آمادہ بعمل ہوئے تو تائید ایزدی سے بہت جلد ہماری کوششیں ثمر بار ہوکر قرآنی نظام کے قیام کے لئے بہت سارے راستے کھل جائینگے جیسا کہ سورہ عنکبوت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (69:29) (مفہوم: ان کے برعکس، جو لوگ اُس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں جو ہم نے ان کے لئے متعین کیا ہے، ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، جو ہر طرف سے آکر صراطِ مستقیم میں مل جاتی اور اس طرح انسانی سعی وکاوش کا رُخ ہمارے متعین کردہ پروگرام کی طرف پھیر دیتی ہیں۔ یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، انہیں اللہ کی تائید ونصرت حاصل رہتی ہے۔ اور علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

نوٹ: اِس تقریب کی تصاویر سرورق کے اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اُسوۂ حسنہ (مسلسل)

دعوتِ ایمان کی پذیرائی اور اس کی بنیاد پر اعمالِ صالحہ سے مزین انفرادی زندگی کے انداز میں جو تغیر واقع ہوتا ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ایسے افراد میں ربطِ باہمی کے لئے ایک نظام تشکیل دیا جائے تاکہ وہ معاشرتی تبدیلی کی منظم کوششوں کا حصہ بن سکیں۔

> ایمان اور عمل صالح سے باعزت اور واجب التکریم انسانوں کے اجتماع کے لئے تشکیلِ اُمت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس اُمت کا مرکز رسولِ خدا ﷺ کی ذات گرامی تھی آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا سب سے نمایاں اور اہم ترین پہلو محبت آفرینی ہے۔ آپ ﷺ نے خاندان اور قبائلی تعصب میں گرفتار انسانوں میں مکمل محبت کی شمع روشن کی۔ جس کے سوز سے ان کے دلوں میں ایک طرف تقویٰ اور دوسری جانب غمِ انسانیت پیدا ہوا۔

انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ مروج طریقوں میں اس نے سب سے پہلے خاندان کو باہمی ربط کا ذریعہ بنایا۔ پھر خاندان سے آبائی و پشتی خاندانوں کے ساتھ مل کر قبیلہ کی تشکیل کی اور قبائلی روایات کی اطاعت کو مل جل کر رہنے کا اسلوب قرار دیا۔ جن علاقوں میں قبائلی روابط سے وسیع تر انتظام ضروری تھا، اسے شعوب کا درجہ دیا گیا اور یہی چیز اس کے نظمِ اجتماعی میں سرداری، حکومت اور مملکت کی بنیاد بنی۔

تشکیلِ اُمت:

نبیٔ اکرم ﷺ پر قرآنِ کریم کا نزول ہوا تو اس نے ایک نیا اسلوبِ پیش کیا اور انسانی معاشرتی زندگی کا بندھن قبائلی اور شعوبی روایات کو قرار نہیں دیا بلکہ کہا کہ:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰىكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ﴿۱۳﴾ (49:13)

معنیٰ ومفہوم:

''اے نوعِ انسانی! ہم نے تم انسانوں کو مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا کیا ہے۔ رہے مختلف خاندان یا قبیلے یا کسی جداعلیٰ سے منسوب قبائلی مجموعہ، تو اس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو (کہ ان کی قبائلی اقدار کا پس منظر کیا ہے) ورنہ نہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے سے افضل ہے، نہ کوئی خاندان، کسی دوسرے خاندان سے عزیز۔ میزانِ خداوندی کی رُو سے، عزت وتکریم کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ ہے کہ تم میں کس کی زندگی قوانینِ خداوندی کے زیادہ مطابق ہے۔ کون ان کی اطاعت زیادہ کرتا ہے۔ جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ یا کسی خاندان یا کسی قبیلے میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں معیار فضیلت، حسب ونسب نہیں، ذاتی جوہر اور سیرت وکردار کی بلندی ہے۔ یہ بات وہ خدا کہہ رہا ہے جو اچھی طرح جانتا ہے کہ فضیلت کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔''

ایمان اور عمل صالح سے باعزت اور واجب التکریم انسانوں کے اجتماع کے لئے تشکیلِ اُمت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس اُمت کا مرکز رسولِ خدا ﷺ کی ذات گرامی تھی آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا سب سے نمایاں اور اہم ترین پہلو محبت آفرینی ہے۔ آپ ﷺ نے خاندان اور قبائلی تعصب میں گرفتار انسانوں میں مکمل محبت کی شمع روشن کی۔ جس کے سوز سے ان کے دلوں میں ایک طرف تقویٰ اور دوسری جانب غمِ انسانیت پیدا ہوا۔ یہ شمعِ محبت، جس کے مقدر میں بجھنا نہیں ہے، انسانیت کے کسی نہ کسی گوشے میں روشن رہتی ہے اور عالمگیر انسانیت اس کے فیضان سے مستفید ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے انسانوں کے باہمی تعلق کی بنیاد ایمان اور اعمالِ صالحہ (آئیڈیالوجی) کو قرار دیا اور مومنوں کی ایک نئی برادری اور اُخوت کی تشکیل کی بنیاد رکھی فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (49:10)

ترجمہ: ''یقیناً سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔

اور اس اخوت کی بنیاد نعمتِ خداوندی ہے جسے حَبْلُ اللہ کہا گیا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳ (3:103)

مفہوم: ''یاد رکھو! دین نہ انفرادی مسلک کا نام ہے، نہ گروہ بندیوں کے طریقے کا۔ لہٰذا تمہارے لئے

ضروری ہے کہ تم، سب کے سب، بلا استثنا، اجتماعی طور پر، اس نظام کے ساتھ، محکم طور پر، وابستہ رہو اور اُمت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو (کہ فرقہ بندی شرک ہے (32-30:31) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (3:106؛6:65)۔ ایسا کرنے والوں کے ساتھ رسول ﷺ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا (6:153؛6:159)۔ تم اپنی پچھلی حالت کو یاد کرو، جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے، فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے اس حالت میں، تمہیں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا جس سے (تم میں صرف ظاہراً اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا اس طرح، ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر، ایک برادری بن جانا، کتنا بڑا انعامِ خداوندی تھا۔ تم اس سے پہلے، ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے، کہ اس (نظامِ خداوندی) نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا (49:10؛8:63)۔

> قرآنِ کریم نے بنیادی قوانین واقدار بیان کئے ہیں اور سوائے چند کے ان کی جزئیات نہیں بتائیں۔ جو تفاصیل قرآن میں بیان ہوتی ہیں، ان میں تغیر وتبدیل نہیں ہوسکتا۔ انہیں مِن وعَن نافذ کرنا ہوگا۔ جو تفاصیل نہیں بتائیں انہیں ان اصولی قوانین واقدار کے تابع رہتے ہوئے، سربراہِ نظام کی زیرِ نگرانی باہمی مشورہ سے طے کرنا ہوگا

اللہ اس طرح اپنے قوانین وضوابط، اور ان کے نتائج وثمرات، واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3:104)

مفہوم: ''اس نظام کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ تم ایک ایسی جماعت بن کر رہو (3:110؛2:143) جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ تمام نوعِ انسان کو قرآن کی طرف دعوت دے (22:78)۔ اُن امور کو عملاً نافذ کرے جنہیں قرآنِ کریم صحیح تسلیم کرے اور ان سے روکے جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں (یہی فریضہ اس وقت یہ رسول ﷺ ادا کر رہا ہے اور ایسا ہی تمہیں بھی کرنا ہوگا (9:112؛9:71؛7:157)۔ اس کے لئے تمکن فی الارض۔ اپنی آزاد مملکت کا وجود۔ ناگزیر ہے (22:41))۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی سعی وعمل کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں اور جو نہایت کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں (23:1)۔

نبیٔ کریم نے نوعِ انسانی کے نشوونما دینے والے پر ایمان اور اس کے قانون پر بھروسہ کی دعوت کو عام کیا تو خوش بخت

انسانوں نے اس پر لبیک کہا اور یوں ایک اُمت اور ایک اخوت تشکیل پاتی چلی گئی۔ ان کا انداز یہ تھا:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۔۔۔(3:193)۔

مفہوم: ''اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو، اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ۔ ہم نے اس دعوت پر لبیک کہا، اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔''

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝۱۹۵ (3:195)

مفہوم: ''تو خدا کے قانون نے آگے بڑھ کر ان کی پکار کا جواب دیا (2:188) اور کہا کہ تم میں سے جو بھی ہمارے قانون کے مطابق عمل کرے گا اس کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ خواہ مرد ہو یا عورت کہ تم ایک ہی نوع کے افراد ہو۔۔۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے قوانین کے مطابق معاشرہ کی تشکیل میں تمہیں بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں تمہیں، اپنی ہر عزیز متاع کو چھوڑنا پڑے۔ تم گھروں سے بے گھر ہوجاؤ۔ بُری طرح سے ستائے جاؤ۔ لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جانیں دینی پڑیں۔۔۔ سو جو لوگ اِس پروگرام میں پورے اتریں گے، ان کے حسنِ عمل کی بدولت، ان کی چھوٹی موٹی ناہمواریوں کو مٹا دیا جائے گا، اور انہیں ایسی شادابیاں عطا ہوں گی جن پر کبھی، افسردگی اور پژمردگی نہیں چھائے گی۔ وہ ہمیں تروتازہ رہیں گی۔ یہ خدا کی طرف سے ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اعمال کا ایسا حسن کارانہ بدلہ، قانونِ خداوندی کی رُو سے ہی مل سکتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کی زیرِنگرانی اُمت کی تشکیل اور ان کے اسوۂ حسنہ کے اتباع (7:158) سے یہ جماعتِ مومنین اپنی ذمہ داریاں سمجھ لیتے ہوئے، استخلاف فی الارض کی مستحق بن گئی:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (24:55)

مفہوم: ''ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں' یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (33:27) (اور ان کی حکومت' اس خطۂ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی 39:74) —— یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن فی الارض) عطا کی تھی (28:6)—— اسی قانون کے مطابق ہم ان کے اِیمان اور اعمال کے نتیجے میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے اور ان کے اُس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے (تمکن کا مفہوم دیکھیں 22:41 میں) جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف' امن سے بدل جائے گا' تاکہ وہ نہایت اطمینان سے' ہمارے' اور صرف ہمارے' قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اَور کی بھی اطاعت کریں' اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں۔ (دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانین خداوندی کے ساتھ' اِنسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں)۔

(لیکن اسے اچھی طرح سن رکھو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا۔ جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ' ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد' اس سے عملاً انکار کر دیں گے (اور' احکامِ خداوندی کے بجائے' اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں گے) تو یہ لوگ' اس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو انہیں صحیح منزل کی طرف لئے جا رہی تھی' اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے۔ (اور اس لئے' اس جنتی معاشرہ کی برکتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ برکات اِیمان وعمل کا نتیجہ تھیں۔ جب اِیمان وعمل نہ رہا تو وہ برکات کیسے باقی رہیں گی؟)۔

اقامتِ صلوٰۃ:

ایمان اور اعمال صالحہ سے مزین ہونے والے اور دائرہ اخوتِ ایمانی میں شریک اصحاب کے احکامِ الٰہی سے وابستگی، حدود اللہ کے اندر رہنے، کتاب اللہ سے تمسک اور اپنی خامیوں کو رفع کر کے نوعِ انسانی کی خدمت جیسے مقاصد کے حصول کے لئے رسولِ خدا نے خدائی راہنمائی میں ما انزل اللہ کے مطابق نظامِ صلوٰۃ قائم کیا۔ اس اقامت الصلوٰۃ سے مراد وحی الٰہی کے دیئے ہوئے پروگرام پر عملِ پیرا ہونے کی راہیں ہموار کرنا تھا۔ فرمانِ خداوندی ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ (42:38)

مفہوم: ''یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اُس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ نظام صلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں جو انہیں یہ سکھاتا ہے کہ تمام امور کے فیصلے، قوانین خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں۔ اور جو سامانِ زیست انہیں حاصل ہو (اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر، باقی) نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رہنا چاہئے''۔

یہ اقامتِ صلوٰۃ انفرادیت کے ساتھ تشکیلِ اُمت اور اجتماعیت کے معاشرتی عدل واستحکام کی طرف عمل کا آغاز کرتا اور اسے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

یہ اقامتِ صلوٰۃ ایک مؤقت فریضہ خداوندی ہے (4:103) اس کے ذریعہ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ (7:170)، تلاوتِ وحی (مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ) (29:45)، خدائی احکام واقدار کو سامنے رکھنا اور یاددہانی (20:14)، اپنی خامیوں کو رفع کرنا (3:193)، صبر واستقامت جسمانی تقاضوں اور جذبات پر کنٹرول، یضائے عہد، حق وانصاف کے مطابق شہادت۔ سائل ومحروم کو ادائیگیٔ مال اور قانونِ مکافاتِ عمل کی تصدیق (70:22-35) جیسی خوبیوں کا حصول ممکن بنایا گیا ہے۔

> مفاد پرست مافیاؤں پر سخت نگرانی سے انسانی ضروریات کی بلا روک ٹوک فراہمی جاری رہے (7:107)۔ معاشرہ میں جنتی ماحول پیدا کیا جائے اور کوئی شخص نہ بھوکا رہے اور نہ ضروری لباس سے محروم ہو۔ موسمی تغیرات کا بروقت نوٹس لیا جائے اور ماحول کی گرمی میں لوگ پیاسے نہ رہیں او رنہ دھوپ سے تنگ (20:118-119) الغرض، دینِ اسلام کا قیام، نظامِ صلوٰۃ کی استواری پر مبنی ہے (107:1؛42:38،42:13)

اقامتِ صلوٰۃ سے قبل حالت جنبی میں ضروری ہو تو غسل (4:43؛ 5:6) ورنہ صرف وضو کو لازمی ٹھہرایا گیا ہے (5:6) پانی نہ ملنے (یا مضر ہونے) کی صورت میں تیمم کی سہولت رکھی گئی ہے (4:43)۔ مدہوشی اور بے جانے سمجھے الفاظ کی ادائیگی سے منع کیا گیا ہے (4:43)۔ صلوٰۃ میں تلاوت دھیمی آواز سے ہوگی (17:110)۔ جب باجماعت صلوٰۃ میں امام قراءت کرے گا تو اسے سُنا جائے گا (7:204)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، صلوٰۃ ایک مؤقت فریضہ ہے (4:103)۔ اسے دن کے دونوں اطراف اور رات گئے (11:114)، دلوکِ شمس (سورج ڈھلنے) سے ابتدائے شب کی تاریکی تک ادا کرنا ہوگا (17:78)۔ پرائیویسی کے اوقات کے حوالہ سے قرآنِ کریم نے ''صلوٰۃ الفجر سے پہلے'' اور ''صلوٰۃ العشاء کے بعد'' کا تذکرہ کیا ہے (24:58)۔

قرآنِ کریم میں ہے حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ۚ (2:238)۔ (ترجمہ: نگہبانی کرو سب صلوٰت کی اور درمیان والی صلوٰۃ کی) یہاں صلوٰت جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ''تین یا تین سے زیادہ'' اور صلوٰۃِ وسطیٰ۔ یوں تین کے بعد صلوٰۃِ وسطیٰ ہوگی تو تعداد کم از کم پانچ ہو جائے گی۔ نبیٔ کریم ﷺ (یا راہنمایانِ اُمت) کے لئے تہجد اضافی ہوگی (17:99)۔ باجماعت صلوٰۃ کا قیام مساجد میں ہوگا (2:114؛ 18-9:17؛ 22:40؛ 24:36؛ 72:18)۔ اس دوران تجارت اور بیع اور کھیل تماشے نہیں ہوں گے (24:37؛ 11، 62:9)۔ صلوٰۃ کے لئے پکارا جائے گا۔ اذان (62:9؛5:58)۔ مومنین جلدی جلدی دیگر کام چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف آئیں گے (62:9)۔ امام لیڈ کرے گا اور مومنین اس کے ساتھ ہوں گے (4:102)۔

صلوٰۃ میں قیام (8 3 2: 2؛ 2 0 1: 4؛ 0 2: 3 7)، رکوع (3 4: 2؛ 5 5: 5؛ 7 7: 2 2) اور سجدہ (50:40؛22:77) ہوں گے۔ صلوٰۃ کی ابتداء ہوگی اور اسے پورا اور مکمل کرنا ہوگا (62:10؛4:103)۔ سفر کے دوران اگر دشمنوں سے خطرہ ہو تو صلوٰۃ قصر ہو سکتی ہے (4:101)۔ صلوٰۃ کی ادائیگی میں اگر کوئی خصوصی اجتماع کا تقرر کیا جائے تو اس دن باقی کام چھوڑ کر سرعت سے اس میں شریک ہونا ہوگا۔ یہ دن متعین ہو تو یوم الجمعہ کہلائے گا ورنہ جس دن یہ اجتماع بلایا جائے، اس میں شرکت کا یہی انداز ہوگا (62:9)۔

قرآنِ کریم نے بنیادی قوانین و اقدار بیان کئے ہیں اور سوائے چند کے ان کی جزئیات نہیں بتائیں۔ جو تفاصیل قرآن میں بیان ہوتی ہیں، ان میں تغیر و تبدیل نہیں ہو سکتا۔ انہیں مِن وعَن نافذ کرنا ہوگا۔ جو تفاصیل نہیں بتائیں انہیں ان اصولی قوانین و اقدار کے تابع رہتے ہوئے، سربراہِ نظام کی زیرِ نگرانی باہمی مشورہ سے طے کرنا ہوگا:

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ ۪ (42:38)

مفہوم: ''اور وہ لوگ جو خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے، آگے بڑھتے ہیں، اس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں جو انہیں سکھاتا ہے کہ تمام امور کے فیصلے، قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں۔''

نبیٔ کریم ﷺ کو بھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کا حکم دیا گیا تھا:

وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ (3:159)

ترجمہ: ''اور کاموں میں (ان ساتھیوں) سے مشورہ لو اور جو کسی بات کا ارادہ پکا کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔''

ظاہر ہوا کہ قوانین و اقدارِ خداوندی جو منزل من اللہ ہیں، ان کی پوری پوری اطاعت کی جائے گی اور جہاں ان کو بروئے کار لانے کے لئے جزوی قوانین بنانے پڑیں، انہیں سربراہِ معاشرہ اسلامیِ ساتھیوں کے باہمی مشورہ سے طے کرے گا۔

قرآنِ کریم نے ایسے امور طے کرنے کی اجازت دے رکھی ہے(42:21)۔ چنانچہ نبیٔ کریم ﷺ نے صلوٰۃ کے لئے ندا کرنے یا بلانے کے لئے اذان کے کلمات کا تعین اسی اصول سے کیا اور دیگر تفصیلات صلوٰۃ بھی طے فرمائیں جنہیں اسوۂ حسنہ کا مرتبہ ومقام حاصل ہے۔

یہ نظامِ صلوٰۃ ہی ہے جس میں نبیٔ کریم ﷺ بعد صلوٰۃ عدالتی امور کے بارے میں ضروری کارروائی فرماتے اور اختلافی معاملات کے فیصلے کرتے تھے(107-5:106)۔ یہی نظام اس بات کا ذمہ دار تھا کہ یتیم رہ جانے والے بچے اور بے شوہر (یتیم) عورتیں معاشرہ میں تنہا نہ رہ جائیں اور دَر دَر کے دھکے نہ کھائیں، جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے اور ناداری کے سبب جن کی نبضیں بند اور سانسیں رک رہی ہوں، ان کے طعام اور روانیٔ حیات کا بندوبست کیا جائے(3-107:2)۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر شخص کو میسر آنا چاہئے ان پر روک نہ لگادی جائے(7:107) اور اس طرح مفاد پرست مافیاؤں پر سخت نگرانی سے انسانی ضروریات کی بلا روک ٹوک فراہمی جاری رہے(7:107)۔ معاشرہ میں جنتی ماحول پیدا کیا جائے اور کوئی شخص نہ بھوکا رہے اور نہ ضروری لباس سے محروم ہو۔ موسمی تغیرات کا بروقت نوٹس لیا جائے اور ماحول کی گرمی میں لوگ پیاسے نہ رہیں اور نہ دھوپ سے تنگ(119-20:118) الغرض، دینِ اسلام کا قیام، نظامِ صلوٰۃ کی استواری پر مبنی ہے(107:1؛42:38،42:13)

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ (29:45)

مفہوم: ''یقیناً یہ نظامِ صلوٰۃ لوگوں کو ان کی اس روش سے روک دے گا جس کی رُو سے، ہر فرد سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اور دوسروں کی پرورش کا خیال کسی کو نہیں آتا اور اس مقصد کے حصول کے لئے، عقل خود بیں کی قریب کاریاں، انہیں عجیب عجیب طریقے سمجھاتی رہتی ہیں(27-70:21)۔ فحشا، اور مُنکر سے روکنے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو شرفِ عظیم عطا کرتا ہے اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔''

نظامِ صلوٰۃ اور اس کے برکات وافادیت کا تذکرہ اور تشکیلِ اُمت میں اس کا کردار، سطورِ بالا میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ وحیٔ خداوندی کے مطابق یہ بہت اہم پروگرام ہے لیکن انسانی عقلِ فریب کار اسی نظام کی تخریب سے دین کے مقاصد کی تکذیب کرنے کی راہ بھی دکھا سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ نظامِ صلوٰۃ مؤمنین کے بھائی چارے اور اخوت کا ضامن ہے۔ ان کے دلوں کو ملانے اور ایک دوسرے کے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو غلط کار انسانوں کی سازشوں سے آگاہ ہے، ایک وارننگ دی ہے:

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ (30:31-32)

مفہوم: ''یہ نظام کیا ہے؟ یہ کہ سفرِ زندگی میں تمہارا ہر قدم اُس منزل کی طرف اُٹھے جو خدا نے تمہارے لئے تجویز کی ہے۔ تم اس کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اس کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیبِ خاطر قوانین خداوندی کا اتباع کئے چلا جاتا ہے۔ اس اتباع اور اطاعت میں کسی اَور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو۔ اس سے، پہلے خود تمہارے اندر وحدتِ فکر و عمل پیدا ہو جائے گی، اور اس کے بعد، پوری نوعِ انسانی، اپنے اختلافات کو چھوڑ کر امتِ واحدہ بن جائے گی (2:213)۔ یہی دین کا مقصود ہے۔''

''لہٰذا، تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر، پھر سے مشرک نہ بن جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور اس طرح اُمتِ واحدہ رہنے کے بجائے، مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو؛ فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے۔ تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا (42:13; 23:53; 6:159; 3:105)۔''

فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو؛ فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے۔ تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا (42:13; 23:53; 6:159; 3:105)۔''

نبیٔ کریم ﷺ کے زمانہ میں کچھ ہوشیار اور کایاں منافقین نے ایک مسجد بنائی جس کے بارے میں قرآنِ کریم نے خود وضاحت کی ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ (9:107)

مفہوم: ''اور ان منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں (جو اپنی چالوں میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے) ایک مسجد تعمیر کر ڈالی (اور اس طرح یہ ظاہر کیا کہ وہ بڑے پکے مومن اور نظامِ خداوندی کے خدمت گزار ہیں)۔ لیکن اس مسجد سے درحقیقت ان کی غرض یہ تھی کہ اس سے اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے، اور

کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں۔ یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے اور اس طرح یہ مسجد ان لوگوں کے لئے کمیں گاہ بن جائے جو پہلے سے نظامِ خداوندی کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی نیک نیتی سے تعمیر کیا ہے —— لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔''

اس تبصرہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (9:108)

مفہوم: ''تم' اے رسولؐ! اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا (جو مسجد' مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دے' کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ اس میں قدم رکھا جائے؟ تمہارا' نہ ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہو سکتا ہے' نہ ان کی تعمیر کردہ مسجد سے کوئی تعلق 6:159)۔ اس کی مستحق صرف وہ مسجد ہے جس کی بنیاد' پہلے دن سے' قوانین خداوندی کی نگہداشت کے اصولِ محکم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہی لوگ آتے ہیں جو' فرقہ بندی اور گروہ سازی کے شرک سے پاک اور صاف رہتے ہیں (30:30)۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ [یاد رکھو! اِسلام کی غایت عالمگیر اِنسانیت کی وحدت ہے (10:19; 2:213)۔ اس عظیم پروگرام کا آغاز ایک اُمت کی تشکیل سے ہوتا ہے (2:213)۔ لہٰذا' جب اُمت میں وحدت نہ رہے؛ تفرقہ پیدا ہو جائے تو اِسلام کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اِس نہج سے تفرقہ شرک ہے (30:31)۔ ایسے لوگ اُمتِ محمدیہؐ کے افراد نہیں' کہلا سکتے (6:152; 6:158)۔ یہ عذابِ خداوندی میں ماخوذ ہو جاتے ہیں (3:106)]۔''

یہ منافقین، صلوٰۃ کے ارکان کی ظاہری شکل وصورت کو صلوٰۃ (نماز) ٹھہراتے ہیں اور صلوٰۃ کی حقیقت پر ان کی نظر نہیں ہوتی جو دین کی بنیاد ہے اور یتیموں کی سرپرستی اور مساکین کے طعام کا انتظام کرتی اور اشیائے مستعملہ کے ہر شخص کی دسترس میں ہونے میں بننے والی رکاوٹ کو ہٹاتی ہے (107:1-7)۔ ان منافقین کے نیک بنتی کے بیانات اور قسموں کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ ایسے منافقین کے لئے تباہی ہے۔

رسولِ کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع میں مذکورہ منافقین کے دھوکہ دینے والے اعمال سے محتاط رہنا چاہئے۔

تسوید و تصحیح
محمد ارشد، سلیم اختر

پرویز کا پیغام بچوں کے نام

پرویز صاحب نے کچھ دروس ننھے بچوں کے لئے بھی ریکارڈ کرائے تھے۔ اس سلسلے کے دوسرے درس کی ٹرانسکرپشن مناسب ایڈیٹنگ کے بعد پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ (ادارہ)

السلام علیکم:

آؤ بھئی آجاؤ بیٹھو بیٹھو۔ تم وہاں بیٹھو ذرا۔ اِدھر آجاؤ ذرا ادھر آجاؤ۔ لو بچو تمہارا سبق شروع ہوتا ہے آج تمہارا دوسرا سبق سمجھ لیں۔ یہ ہے اکتوبر کی 6 تاریخ اور 1960ء سنو اب دوسرا سبق۔ تم نے کسان کو تو دیکھا ہوگا وہ زمیندار وہ جو ہل جوتتے ہیں وہ کس محنت سے زمین تیار کرتے ہیں آدھی رات کے وقت اُٹھ کر ہل جوتتا ہے زمین میں کھاد ڈالتا ہے۔ اچھے سے اچھا بیج ڈالتا ہے اسے بوتا ہے پھر جاڑے (سردی) کی راتوں میں اُٹھ کر کھیت کو پانی دیتا ہے سخت گرمی کی دھوپ میں اس کی گھاس پھوس نکالتا ہے۔ یہ اس طرح دن رات مشقت کرتا رہتا ہے تم سوچو کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے محض اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ اگر کھیت پر محنت کی گئی اور اس کی اچھی طرح سے رکھوالی ہوئی تو تھوڑے سے بیج سے اس قدر غلہ پیدا ہو جائے گا کہ جو سال بھر تک اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضرورتوں کو پورا کر دے گا۔ بلکہ اس کی ضرورتوں سے بہت زیادہ ہوگا تو وہ شہر میں لا کر بیچے گا اور بچو جو ہم تم شہر میں رہنے والے ہیں ہمیں اس غلہ سے روٹی ملتی ہے جسے کسان اتنی محنت سے اُگاتا ہے۔ تم سن لو کہ وہ محنت کیوں کرتا ہے اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ اس محنت سے تھوڑے سے غلہ سے اتنا غلہ پیدا ہو جائے گا کہ وہ تمام ضرورتوں کو پورا کر دے گا۔

سوچو کہ اگر اس کو اس کا یقین نہ ہو تو وہ نہ کبھی کھیت میں بیج ڈالے گا نہ اس پر محنت مشقت کرے گا۔

ٹھیک ہے نہ بات؟ تم بھی بڑی محنت کرتے ہو نا کیوں محنت کرتے ہو تمہیں یقین ہے کہ محنت کرنے سے تم امتحان میں پاس ہو کر اگلی جماعت میں چلے جاؤ گے اور اس طرح سے بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ کسی بات پر اس طرح یقین رکھنے کو عربی زبان میں ایمان کہتے ہیں۔ سمجھ لیا تم نے ایمان کسے کہتے ہیں۔ یعنی کسان کا اس پر ایمان ہوتا ہے کہ کتنا بیج ہو اور اسے قاعدہ کے مطابق بویا جائے تو اس میں سے کس قدر غلہ پیدا ہو کر رہتا ہے اسے کہتے ہیں ایمان۔ جو شخص کسی بات پر ایمان رکھے اسے کہتے ہیں مومن۔ سمجھ لیا۔ یہ دیکھئے (گھڑی کیا بجا رہی ہے) اسے کہتے ہیں مومن۔ جو شخص کسی بات پر پورا پورا یقین رکھے اسے کہتے ہیں مومن

اور جو اس پر ایمان نہ لائے اسے کہتے ہیں کافر۔ بچو! کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے اس کے معنی ہیں نہ ماننے والا۔

جو کسی بات کو ماننے والا ہو وہ مومن اور جو بات کو نہ ماننے والا ہو وہ کافر۔ جو سچی بات کو مانے وہ مومن اور جو سچی بات کو نہ مانے وہ کافر۔ اب ایک اور بات جیسے پہلے ہمارے ہاں دیسی کپاس ہوا کرتی تھی کچھ عرصہ ہوا زراعت کے محکمے والوں نے امریکن کپاس کا بیج منگوالیا اور کسانوں سے کہا کہ وہ اس کپاس کی جگہ اُس نئی کپاس کی کاشت کریں لیکن کسان اس کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہمیں کیا پتا کہ اس نئے بیج سے کیا اُگے گا اور اس سے کس قسم کی کپاس پیدا ہوگی۔ کپاس کا تمہیں پتا ہے نا کہ جس سے روئی بنتی ہے پھر روئی سے دھاگہ بنتا ہے اور پھر اس سے تمہارے کپڑے بنتے ہیں۔ یہ سب چیزیں کپاس سے بنتی ہیں۔ یہ محکمے والے ان کو سمجھاتے تھے کہ اس نئے بیج سے تمہیں بہت فائدہ ہوگا وہ ایک نہیں مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہم نے آج تک امریکن کپاس دیکھی ہی نہیں ہم کس طرح یقین کرلیں کہ وہ ہماری دیسی کپاس سے اچھی ہوگی۔ بہت سے کسان تو یہ بات کہتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے زراعت کے محکمے والوں سے اس نئے بیج کے مطابق بہت سی باتیں دریافت کیں پھر ان باتوں پر اچھی طرح غور کیا پھر اُنہوں نے یہ بھی سوچا کہ زراعت کے محکمے والوں نے اس سے پہلے جتنی باتیں کہی تھیں وہ سب ٹھیک نکلیں اس لئے یہ بات بھی ٹھیک ہی ہوگی۔ چنانچہ پھر انہوں نے یہ بات مان لی اور نئے بیج کو بو دیا۔ اس سے بڑی عمدہ کپاس پیدا ہوئی پھر دوسرے سال ان کے دیکھا دیکھی سب کسانوں نے امریکن کپاس بو دی۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس نئی کپاس کے بونے کا رواج عام ہوگیا۔

دیکھو بچو جس طرح ان کسانوں نے محکمہ زراعت کی بات مان لی تھی اس طرح یقین کرنے کو غیب پر ایمان لانا کہتے ہیں۔ غیب کے کیا معنی ہوئے یعنی کسی تجویز کے اَن دیکھے نتیجہ پر یقین کرنے کو۔ انہوں نے دیکھا تو نہیں تھا کہ بیج سے کس قسم کی کپاس پیدا ہوتی ہے انہوں نے محکمے والوں کی بات پر یقین کرلیا اس طرح جو نتیجے ابھی سامنے نہیں آئے تھے، ان پر ایمان لے آئے اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب ظاہر ہے کسی نئی بات پر عمل کرنے کے لئے اس طرح کے ایمان کی بڑی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا بچو! ربانی بننے کے لئے جو باتیں قرآن شریف میں لکھی ہیں ضروری ہے کہ ہم ان پر ایمان لائیں اور جن جن باتوں کے نتیجوں کو ابھی تک ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا ان پر ہمارا ایمان بالغیب ہو۔ جب ہم ان باتوں پر عمل بھی کریں گے تو پھر ان کے اچھے اچھے نتائج اس طرح ہمارے سامنے آجائیں گے جس طرح ان کسانوں کے سامنے نئی کپاس کی فصل کے نتیجے آئے تھے یاد رکھو ایمان کا نتیجہ عمل ہی سے نکلتا ہے۔

عمل کے معنی ہیں کام کرنا جو بات مان لی جائے اس کے مطابق کام کرنا۔ اس سے اچھا نتیجہ نکلتا ہے سمجھ گئے؟ تمہیں اب بتاتے جائیں کہ صبح دانتوں کی صفائی کیا کرو اور تم کہو بہت اچھی بات ہے ہم مان لیتے ہیں لیکن صبح اُٹھ کر تم یہ کام نہ کرو تمہارے دانتوں کی صفائی تو نہیں ہوگی۔ کیسے ہوگی دانتوں کی صفائی؟ یہ بات ماننے کے بعد صبح اُٹھ کر برش سے دانتوں کو صاف کرنے سے دانتوں کی صفائی ہوگی اسے کہتے

ہیں بیٹا عمل کرنا۔ کام کرنا۔ پہلی بات تو یہ کسی کا کہنا مان لینا اور دوسری بات ہے اس پر عمل کرنا اسے کہتے ہیں ایمان اور عمل بس ایمان اور عمل سے سب کام دنیا میں ٹھیک ہوتے ہیں سچی بات کو مان لینا پھر اس کے مطابق کام کرنا۔

اچھا بھئی یہ اب ایک بات اور۔ مان لو یہ تو ہے مومن اب دنیا میں ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا بہت بُرا ہے، یہ مانتا ہے کہ جھوٹ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن تم دیکھتے ہو اس کے باوجود لوگ جھوٹ بولتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ کسی بات کا صحیح مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جس بات کو صحیح مانا جائے اس سے کسی حالت میں بھی سرتابی نہیں کرنی چاہئے سرتابی کے معنی ہیں اس کے خلاف کرنا۔ صحیح بات کے سامنے اپنا سر جھکا دینا چاہئے جو شخص سچی بات کے سامنے اپنا سر جھکا دے اسے تسلیم کر لے اسے عربی میں مسلم کہتے ہیں۔ اس لئے اسلام کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کے کے حکموں کے سامنے اپنا سر جھکا دیا جائے۔ یعنی مسلم وہ ہے۔ اب قرآن کریم کی بات آتی ہے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 112 مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۪ اور وہ جو اپنے تمام ارادوں کو خدا کے حکموں کے سامنے جھکا دے اور نہایت عمدگی سے ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اسے کہتے ہیں مسلم۔ جو ایسا نہیں کرتا اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ سیدھی سی بات ہے جو یہ بات سن لیتا ہے کہ دانتوں کی صفائی کرنی چاہئے اس کے سامنے اپنا سر بھی جھکاتا ہے لیکن صبح اٹھ کر دانتوں کی صفائی نہیں کرتا، اس کے دانتوں کی صفائی نہیں ہو سکتی۔

اس کے لئے ضروری ہے جو کچھ مانا جائے اس کے مطابق کام بھی کیا جائے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں سورۃ المائدہ میں جو ان الفاظ میں کہا گیا ہے اسے بیٹا اچھی طرح سن لو وہ الفاظ کیا ہیں قرآن شریف میں آیت آئی ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) سورۃ المائدہ آیت نمبر 44 اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اُتارا ہے کہا ہے وہ شخص اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا اس کے مطابق کام نہیں کرتا اسے کافر کہتے ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ زبانی ایمان لے آنا قرآن شریف کو مان لینا مومن ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ مومن ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو کچھ مانا جائے اس کے مطابق کام بھی کیا جائے۔ ٹھیک ہے نہ بچو! اگر تم سکول کا کام کر کے نہیں جاؤ گے تو یاد رکھو معاشرے میں تمہیں کوئی بھی اچھا نہیں کہے گا۔ اور تم فیل بھی ہو جاؤ گے۔ اس لئے کسی چیز کا ماننا اور پھر اس کے مطابق کام کرنا بڑی ضروری چیز ہے۔ سمجھ گئے؟ لو بھئی اب ہم تمہیں کچھ ایسی باتیں بتاتے ہیں جن کے مطابق کام کرنے سے انسان سچا مومن اور پکا مسلمان ہو جاتا ہے۔ سمجھ گئے تم چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں روزمرہ کی زندگی کی باتیں ہیں۔

تمہیں ہم بتاتے ہیں کہ وہ کیا چیزیں ہیں کہ جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے سچا مومن پکا مسلمان انسان ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ ہم کل بتائیں گے آج دیر ہو گئی ہے آج کا سبق پورا ہو گیا لو بھئی دو سبق تمہارے ہو گئے اب تمہیں کل آنا ہے اچھا بچو! اب کہو السلام علیکم۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے زوال میں پرستش کا کردار

قرآنِ کریم مسلمانوں کی زندگی کا محور و مرکز ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ساری انسانیت کی نگرانی کرنا (2:143) اور ان کی خدمت کرنا ہے (3:118)، قرآنِ کریم وہ ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جس میں انسانیت کے مسائل اس طرح حل ہو جاتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کا Due مل جاتا ہے۔ یہ نظام ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں خوف و حزن نام کی کوئی چیز نہیں رہتی (2:277)، (2:38)، اس میں مکمل امن و سلامتی ہوتی ہے (3:97) قرآنی نظام میں ہر شخص کی خوابیدہ صلاحیتیں پوری پوری طور پر بیدار ہو جاتی ہیں (3:164)، (62:2)، اس میں رزق کی فراوانی ہوتی ہے (11:6)، (6:151) قرآنِ کریم کا یہ وعدہ ہے کہ قرآن کا یہ نظام غالب آ کر رہے گا (9:33، 48:28، 61:9) یہ نظام ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے (24:55، 35:10) اس میں تشدد کا زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم کے ان تمام وعدوں کے برخلاف آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی حالت نہایت افسوسناک حد تک تباہی و بربادی سے دوچار ہے۔ یہ حالت مسلمانوں کے ایک یا دو ملکوں کی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے جتنے بھی ممالک ہیں وہ سب اسی زوال اور کسمپرسی کا شکار ہیں اور اس کا سبب اور قدرِ مشترک ہمارے وہ عقائد ہیں جو ہمیں زوال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہمارے اس زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو بالکل ترک کر دیا ہے اور پرستش اور پوجا پاٹ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے دیا ہے ہمارے ہاں رات دن ہر شخص پرستش میں مصروف ہے اور دوسروں کو بھی پرستش کی ترغیب و تلقین کرتا ہے۔

> اصل اطاعت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہے اللہ تعالیٰ چونکہ ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے اس لیے اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا رسول ہے (4:80، 4:64)

مسلمانوں کے زوال کا سبب چونکہ پرستش ہے اس لیے ہمارے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم پہلے اطاعتِ خداوندی اور پرستش کے فرق کو واضح کریں۔

پرستش مذہب میں ہوتی ہے اور اطاعتِ خداوندی صرف اور صرف دین (اسلامی نظام) کی معرفت ہو سکتی ہے۔ اطاعت کے لیے اسلامی نظام، یعنی دین کا قیام لازمی چیز ہے۔ اگر دین یعنی اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو اطاعتِ خداوندی

نہیں ہوسکتی، پرستش میں خدا اور انسان کا براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق فرد متعلقہ کے ذہن سے باہر نہیں ہوتا اور یہ سمجھ کر اپنے دل کو مطمئن کرلیا جاتا ہے کہ ہمارا تعلق اللہ سے قائم ہوگیا ہے۔ یہ تعلق خالصتاً انفرادی، داخلی Subjective ہوتا ہے۔ پرستش کرنے میں کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی، آپ ہر جگہ، کونے کھدرے، جنگل صحرا، کسی جگہ بھی پرستش کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اطاعت ہوتی ہے اطاعت کے مفہوم کو صحیح طور پر اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دین قائم فرمایا تھا اور اس نظام کے مقامی حکام، اولوالامر کی اطاعت کو بھی فرض قرار دیا گیا تھا۔ اللہ کی اطاعت صرف رسول کے ذریعے ہوسکتی ہے (4:80، 4:64) آپ رسول کو بیچ میں سے نکال دیں تو اللہ کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح رسول کی اطاعت اولوالامر کے ذریعے ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کی قائم کردہ ریاست دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی۔ حضور ﷺ کے اپنے دورِ مبارک میں بھی جو لوگ مدینے سے دور رہتے تھے وہ اپنے مقدمات مدینہ آکر طے نہیں کراتے تھے بلکہ وہ اپنے مقامی حاکم سے اپنے مقدمات کے فیصلے کراکے، ان کی اطاعت کرتے تھے۔ مقامی حاکم کی اطاعت ہی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہوتی تھی۔ مقامی حکام کی اطاعت کو فرض قرار دینے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں تھی بلکہ اس نظام کی اطاعت واجب و مقصود تھی جو حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔ اس نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت تھی اگر وہ نظام قائم نہ ہو، جیسا کہ اس دور میں قائم نہیں ہے، تو اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ پرستش کے لیے کسی حکم دینے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لوگ پرستش کی رسوم از خود سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اطاعت خداوندی کے لئے ایک محسوس، جیتی جاگتی اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی نظام کے ذریعے، اللہ و رسول کی اطاعت کراتی ہے۔ اسی لیے اطاعت کے لیے سماعت شرط ہوتی ہے ارشادِ عالی ہے۔

(1) وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2:285) ترجمہ: اور کہہ اُٹھے کہ ہم نے سُنا اور ہم نے قبول کیا، تیری بخشش چاہئے۔ اے ہمارے رب اور تیری طرف لوٹ کے جانا ہے۔

(2) ارشاد ہوا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝۲۰ (8:20) اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم مانو، اور اس سے مت پھیرو درآں حالیکہ تم اس کے احکام سن رہے ہو۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ احکام کسی زندہ اتھارٹی سے ہی لیے جاسکتے ہیں اس سماعت کے مفہوم کو اگلی آیت نے اور بھی واضح کر دیا وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (8:21) اور اس طرح نہ ہوجانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے احکامات کو سن لیا، لیکن درحقیقت وہ اس قدر توجہ سے نہیں سنتے کہ ان پر عمل پیرا ہوں۔

(3) فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ (8:24)، اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو، کیونکہ وہ تمہیں اس کی دعوت دیتا ہے کہ جو تمہیں زندگی عطا کرنے والا ہے۔

(4) ارشاد فرمایا: اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24:51) قرآنِ کریم کے احکامات پر عمل کرنا مومن ہونے کا ثبوت ہے اور اس کا عملی Test یہ ہے کہ تمہارے جتنے بھی متنازعہ فیہ امور ہوں تو تم رسول اللہ سے اس کا فیصلہ قرآن کے مطابق کرتے۔ لِيَحْكُمَ کا لفظ صرف پڑھنے کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ یہ کفر اور ایمان کے درمیان واضح امتیاز ہے (5:44)، مومن کو اطاعتِ خداوندی کے لیے بلایا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی اطاعت کرو تو اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اس کی اطاعت کی۔ دین میں اطاعت کے لیے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے اس کے بغیر اطاعت ہو ہی نہیں سکتی، صرف پرستش ہو سکتی ہے۔

(5) ارشادِ عالی ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ (64:16) ترجمہ: تو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو اور سنو اور مانو، اور اپنے بھلے کے لیے خرچ کرو۔ یہاں بھی سماعت، اطاعت کے لیے شرط قرار دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح رہے کہ پرستش کے نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے۔ جبکہ اطاعت کے نتائج اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ (11:93) اے میری قوم تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ، اور میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں نتائج بہت جلد اسی دنیا میں نمودار ہو جائیں گے اور بتا دیں گے کہ کس پر رسوا کُن عذاب آتا ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ چند ہی آیات کے بعد پھر ارشادِ عالی ہوتا ہے وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (122-11:121) اے رسول (ﷺ) کہہ دیجئے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لائے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو، ہم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تم بھی نتائج کا انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں، سورہ زمر میں ارشاد ہوتا ہے قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾ (40-39:39) تو کہہ دو اے قوم تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ۔ میں اپنی جگہ کام کئے جاتا ہوں۔ اب تم جلد جان لوگے کہ کس پر آفت آتی ہے کہ اس کو رسوا کر دے اور اس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب اترتا ہے۔

اطاعت خداوندی میں پرستش کا کسی جگہ کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کو ہم اس طرح واضح کرتے ہیں کہ جس میں اطاعت کے لیے کڑی سے کڑی مل جاتی ہے۔ آپ اس کو صرف توجہ سے ملاحظہ فرمالیں۔

اصل اطاعت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہے اللہ تعالیٰ چونکہ ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے اس لیے اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا رسول ہے (4:80، 4:64) اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا واحد ذریعہ اولوالامر (مقامی حکام) ہیں۔ 4:59 قرآن کریم میں یہ بھی ارشاد عالی ہے فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65) ترجمہ: تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے

اختلافات میں آپ کو حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں اور پھر آپؐ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو مکمل طور پر تسلیم کرلیں۔ رسول اللہؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔ چونکہ حضور ﷺ کے اُن فیصلوں کو عملی طور پر اولوالامر نافذ کرتے تھے، اس لئے ان کی اطاعت فرض تھی اور ان کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت تھی۔ اور اسی وجہ سے حضور نے فرمایا تھا کہ اسلامی مملکت کے حاکموں کی اطاعت میری اطاعت ہے۔

(1) من أطاع محمدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقد أطاع اللہ ومن عصی محمدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقد عصی اللہ و محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرّق بین الناس۔ (ترجمہ) جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمد ﷺ نشان امتیاز ہیں۔ اس اطاعت کی عملی صورت خود حضور ﷺ نے بیان فرمائی اور خود اطاعت کرنے کی کڑی سے کڑی ملادی۔

(2) (ترجمہ) سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب طاعۃ الامام،) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی اطاعت کی تو اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

(3) مسلمان کو لازم ہے کہ وہ اپنے اولوالامر کی بات سنے اور مانے، خواہ اس کو پسند ہو یا ناپسند ہوتا وقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اُسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اُسے نہ کچھ سننا چاہئے اور نہ ماننا چاہئے۔

(4) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جو حاکم کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے جو حاکم کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے (بخاری و مسلم)

(5) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حاکم کا حکم ماننا اور سننا خواہ کسی ایسے حبشی غلام کا حکم ہو جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔ (بخاری و مسلم)

آپ غور فرما رہے ہیں کہ اطاعت کرنے کی کڑیاں کس طرح مل رہی ہیں اور اس میں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے اور رسول کی اطاعت حاکم کے ذریعے ہو رہی ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ اسلامی نظام کا حاکم نہ ہو تو نہ اللہ کی اطاعت ہو سکتی ہے اور نہ

> حضرت موسیٰ ؑ نے فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی تو اس نے اس دعوت کو مسترد کر دیا اور اس دعوت کا مذاق اڑایا اور کہا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت تسلیم کرلیں جو خود ہمارے محکوم ہیں۔ چنانچہ اس جگہ قرآنِ کریم نے محکوم کے لئے عابد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47)

رسول کی۔ اور پرستش اطاعت کا متبادل نہیں ہوسکتی، لیکن ہم اسی دھوکہ میں رہتے ہیں کہ ہم پرستش کے ذریعے اللہ ورسول کی اطاعت کررہے ہیں۔

قرآنِ کریم نے اطاعت کے لفظ کے علاوہ عبادت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور اسی دروازہ سے ہمارے ہاں پرستش داخل کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے مشہور اور مستند ترجمہ میں عبادت کا ترجمہ پوجنا کیا ہے ملاحظہ ہو (39:66، 39:14، 39:17، 43:45، 43:8) اور بکثرت دیگر مقامات ہمارے مترجمین عموماً عبادت کا ترجمہ ''بندگی کیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ بھی Mislead کرتا ہے کیونکہ فارسی زبان میں بندگی کے معنی تابعداری اور غلامی کے ہیں (لغات کشوری) لیکن ہندی میں اس کے معنی پرستش کرنا ہے۔ اس لئے اردو میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کو صرف اور صرف محکومیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

(1) سورہ بقرہ میں، قصاص کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ اَلْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178) یعنی قصاص میں چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ آزاد کے بدلے میں آزاد کو ہی قتل کیا جائے گا اور غلام کے بدلے غلام کو۔ اسی آیۂ کریمہ میں قرآنِ کریم العبد کو الحر کے مقابلے میں لایا ہے حُر آزاد ہوتا ہے اور العبد اس کا غلام ہوتا ہے، وہ اس کی پرستش نہیں کرتا۔ صرف اطاعت کرتا ہے۔

(2) سورہ النحل میں العبد کی Definition، اس سے بھی زیادہ واضح کردی گئی ہے جبکہ ارشاد ہوتا ہے عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (16:75)، ترجمہ: بندہ، پرایا مال، نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر (شیخ الہند)۔ اس آیت میں قرآن نے عبد کی یہ تعریف کی ہے کہ عبد وہ ہوتا ہے جو دوسرے کا مال ہوتا ہے۔ اپنے پر بھی کسی طرح کی قدرت نہیں رکھتا ہر ایک تصرف میں مالک کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے۔ مالک کی اجازت کے بغیر سب تصرفات غیر معتبر ہوتے ہیں۔ اس کو تو اپنی جان تک پر تصرف واختیار نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی غلام اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا اس لئے عبادت کے بنیادی معنی میں پرستش کا کوئی تصور دور دور تک نہیں ہے۔

(3) حضرت موسیٰ ؑ نے فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی تو اس نے اس دعوت کو مسترد کردیا اور اس دعوت کا مذاق اڑایا اور کہا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت تسلیم کرلیں جو خود ہمارے محکوم ہیں۔ چنانچہ اس جگہ قرآنِ کریم نے محکوم کے لئے عابد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) ترجمہ: انہوں نے کہا ہم ان دو اپنے جیسے آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ اُن کی قوم ہماری محکوم ہے۔ اس آیت نے عابد کے معنی واضح کردیئے۔

(4) حضرت موسیٰ ؑ کے حوالہ سے ہی ایک دوسری آیت ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ پر اپنے احسانات یاد دلائے تو حضرت موسیٰ ؑ نے جواب میں فرمایا تھا۔ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26:22) ترجمہ: کیا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کا تم مجھ پر احسان رکھ رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے غور فرمائیں یہاں عبدت کس طرح محکومیت کے مفہوم کو واضح کررہا ہے اور پرستش کی تردید کررہا ہے۔

(5) سورہ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (12:40) ترجمہ: حکومت اللہ کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہوسکتی، اس کے بعد اسی آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ (12:40) ترجمہ: اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو۔ اس ایک ہی آیت میں قرآن نے حکومت اور عبادت کے الفاظ کو ایک ہی معنی میں استعمال کر دیا کہ عبادت کے معنی پرستش کے نہیں بلکہ محکومیت کے ہیں۔

پرستش کے موضوع پر غور کرنے، اور اس کی تردید کرنے کے ذیل میں صلوٰۃ کا موضوع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اقامت صلوٰۃ کا ترجمہ ''نماز پڑھنا'' کر کے، اس کو پرستش کے زمرہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اقامۃ کے لفظ خود پکار پکار کر اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے صلوٰۃ کا پرستش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صلوٰۃ کا ترجمہ نماز کیا جاتا ہے۔ بنو عباس کے دور میں جب ہمارا لٹریچر تحریر کیا گیا تھا، تو ایرانیوں کے زیر اثر قرآنِ کریم کی اصطلاحات کے قرآنی مفہوم ترک کر کے غیر قرآنی مفاہیم اختیار کئے گئے تھے۔ ان اصطلاحات میں صلوٰۃ کا لفظ بھی شامل ہے اور اقامت صلوٰۃ کا ترجمہ ''نماز پڑھنا'' کر دیا گیا۔

> اقامتِ دین اور اقامت صلوٰۃ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور دونوں کے لیے اقتدار شرط ہے (22:41، 24:55) بغیر اقتدار کے نہ اقامت دین ممکن ہے اور نہ ہی اقامتِ صلوٰۃ ممکن ہے اور ہم مسلمانوں کے لیے دونوں کی اقامت فرض ہے۔

سورہ حج میں ارشاد عالی ہوتا ہے اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں زمین پر حکومت دیں تو یہ صلوٰۃ قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکیوں کا حکم کریں اور برائیوں سے منع کریں۔ اس آیۂ کریمہ میں اقامتِ صلوٰۃ کے لیے اقتدار شرط قرار دیا گیا ہے۔ اگر کسی قوم کو اقتدار حاصل نہیں ہے تو وہ قوم اقامتِ صلوٰۃ نہیں کر سکتی۔ مشہور درسی متداول تفسیر جلالین نے اس آیت کے مفہوم کو خوب واضح کیا ہے جو مفہوم ہماری صد فی صد تائید کر رہا ہے۔ اس تفسیر میں تحریر ہے ''یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کام کا حکم کریں اور بُرے کام سے منع کریں۔ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ شرط تھا۔ اقامتِ اصلوٰۃ اور اس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے۔ نیز شرط اور جواب الشرط دونوں صلہ ہیں الذین موصول کے، اس سے قبل ایک مبتداء محذوف ہے ہم تفسیر نے جو عربی گرائمر تحریر کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اقتدار شرط ہے اور اس اقتدار کا جواب الشرط، اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ اگر شرط (اقتدار) پوری نہ ہو، تو جواب الشرط خود ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر شرط ختم ہو جائے، تو مشروط خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس تفسیر کا اصرار یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کے لئے اقتدار ضروری ہے۔ اور Prerequisite قرآنِ کریم کی عائد کردہ اس شرط کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم نماز پڑھنا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ اقامتِ دین اور اقامت صلوٰۃ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور دونوں کے لیے اقتدار شرط ہے (22:41، 24:55) بغیر اقتدار کے نہ اقامت دین ممکن ہے اور نہ ہی اقامتِ صلوٰۃ ممکن ہے اور ہم مسلمانوں کے

لیے دونوں کی اقامت فرض ہے۔ وہ معاشرہ جو قوانینِ خداوندی اور اس کی مستقل اقدار کے مطابق Establish ہوتا ہے، یہ عمل اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔

جہاں تک وقتی اجتماعات صلوٰۃ یعنی نماز پڑھنے کا تعلق ہے یہ اجتماعات صلوٰۃ اسی نظام کا ایک حصہ میں ارشادِ عالی ہے وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (42:38) ترجمہ اور جنہوں نے اپنے رب کی پکار کا جواب دیا، اور نماز کو قائم کیا اور آپس کے مشورہ سے کام کیا اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کیا۔ اسلامی مملکت کو چلانے کے لئے، مقامی انتظامی یونٹ جب مشورہ کرتے ہیں تو اس سے پہلے یہ نماز ادا کرتے ہیں۔ مشورہ سے پیشتر اس نماز کا ادا کرنا اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ ہم اس نظام کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے لئے سجود و رکوع کے ذریعے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان مقامی اداروں میں ادا کی جائے گی، جہاں اس نظام کو چلانے کے لیے مشورے کئے جاتے ہیں یہ نماز اس نظام کے تحت ادا ہوگی اور اس نظام کے کارکنان جن کو قرآنِ کریم نے حاملینِ عرش الٰہی کہا ہے، (40:7، 39:75) وہ ہی اس کو Lead کریں گے چونکہ یہ نماز اس نظام کا حصہ ہوگی، اس کے تحت ہوگی، اس پرستش کے زمرہ میں نہیں آسکتیں، کیونکہ ان مشوروں میں نظام کی اطاعت کے طریقوں پر غور و فکر کیا جائے گا، اور ان مشوروں کے نتائج بھی اسی دنیا میں سامنے آجائیں گے۔

اسلامی مملکت کو چلانے کے لئے، مقامی انتظامی یونٹ جب مشورہ کرتے ہیں تو اس سے پہلے یہ نماز ادا کرتے ہیں۔ مشورہ سے پیشتر اس نماز کا ادا کرنا اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ ہم اس نظام کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے لئے سجود و رکوع کے ذریعے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان مقامی اداروں میں ادا کی جائے گی، جہاں اس نظام کو چلانے کے لیے مشورے کئے جاتے ہیں یہ نماز اس نظام کے تحت ادا ہوگی اور اس نظام کے کارکنان جن کو قرآنِ کریم نے حاملینِ عرش الٰہی کہا ہے، (40:7، 39:75) وہ ہی اس کو Lead کریں گے۔

نماز میں قیام و رکوع و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسی مقصد کے لیے ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہو تو اظہارِ جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی ہو ورنہ اجتماع میں انتشار دکھائی دے گا۔ اطاعت و فرماں پذیری کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔

اُمت کے مختلف فرقے جس طریقے سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں ردّ و بدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت قائم ہوجائے اور وہ اجتماع صلوٰۃ کی ایک شکل تجویز کردے تو اُمت میں وحدت پیدا ہوجائے گی۔ ہم معاشرہ میں اصلاح یا قرآنی معاشرہ کے قیام کی جدوجہد اپنے گھر ہی سے کرسکتے ہیں لیکن اگر خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں گے تو اصلاح کس طرح ہوگی۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوقومی نظریۂ پاکستان والی
اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:3

حیوان کی احساسی جبلی زندگی سے عِلم وآزادیِ اِرادہ کی پیکرِ اِنسانی ذات میں ارتقاء

☆علم النفسیات کی رو سے اِنسانی جبلتوں پر مبنی اِنسان کی طبیعی/حیوانی حیات کا بیان:

علم النفسیات کی اصطلاحات، جبلت (خواہش)، عادت اور ہیجان (احساسی پہلو) سے آگاہی کی بحث میں نفسیات کے ماہرین نے انسان کی طبیعی/حیوانی حیات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ماہرین نفسیات کا اتفاق ہے کہ شخصیت کسی فرد کے ان منفرد خصائص (Unique chacteristics) کی تنظیم ہوتی ہے، جس پر اس فرد کے کردار کا خصوصی اور پیہم انداز درجِ ذیل تین پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔

1۔ اوّل یہ کہ شخصیت منفرد ہوتی ہے۔

2۔ شخصیت بہت سے مختلف خصائص پر جن میں ایک تنظیم پائی جاتی ہے، مشتمل ہوتی ہے۔

3۔ خصائص کی مختلف تنظیم کردار کے خصوصی اور پیہم انداز کو پیدا کرتی ہے۔

> جانوروں میں احتیاجات اور اشتہا، دونوں موجود ہوتے ہیں اور رجحان کے شعور کا احساس بھی کسی قدر ہوتا ہے لیکن غایت کا علم نہیں ہوتا۔ انسانوں میں احتیاجات، اشتہا اور خواہشات تینوں ہی موجود ہوتی ہیں اور انسانی خواہش میں رجحان اور غایت دونوں کے متعلق شعور ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ کسی فرد کی شخصیت بیان کرتے وقت مسئلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس میں کون سے اوصاف پائے اور نہیں پائے جاتے۔ ایک عمومی معیار کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ ہوسکتا ہے کہ فلاں شخص میں فلاں وصف بہت زیادہ پایا جاتا ہے، فلاں وصف کم پایا جاتا ہے اور فلاں وصف بہت کم پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا مؤقف ہے کہ جبلی داعیات/خواہشات عقل سے جدا اور

ہماری روح کے اندھے تقاضوں کے مقاصد پر مبنی ایک منفرد حیثیت میں اپنی تسکین چاہتی ہیں۔ان خواہشات کی تفصیل انہوں نے انسانی ایغو، دوسروں کے متعلق معاشرے اور خدا سے متعلق یوں درج کی ہے۔ایغو کے متعلق خواہشات کے ضمن میں زندگی کو عیش و آرام، بہتات، دولت، معیشت، شہرت، مقبولیت، معزز اور محبوب ہونے میں شامل ہے۔دوسروں سے متعلق خواہشات کے ضمن میں زندگی کو خاندان، بیوی، بچوں اور اُن کے لیے تردّد میں بسر کرنے کو شامل کیا ہے۔معاشرے سے متعلق خواہشات کے ضمن میں زندگی کے مقصد کو عمرانی روابط، دوستی، میل جول، محبت، عدل، سخاوت، قانون و نظام، صدقِ وخلوص، حق گوئی اور اچھے کام کرنے میں مشغول رکھا ہے۔خدا سے متعلق خواہشات کا اُس سے محبت کر کے قرب کے حصول میں حاصل کرنے میں زندگی بسر کرنا ہے۔

جِبلت پر مبنی خواہشات سے انتخاب پر مبنی انسانی شخصیت کی تعمیر کے دو طریقے بتائے جاتے ہیں۔

1۔ پہلا طریقہ ماحول سے شروع ہوتا ہے۔ماحول انسان کو محض ماحول سے سازگار بننے کا آلہ سمجھتا ہے۔یہ نظریہ فکر اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر کے کائنات کی دیگر مخلوقات کی طرح مجبور پاتا ہے۔

2۔دوسرا طریقہ خارجی ماحول کی جگہ، انسان کی داخلی کیفیتوں سے ابتدا کرتا ہے۔داخلی کیفیّتیں انسان کو حوائج، محرکات اور خواہشات کا نظام سمجھتے ہیں، جو ہمیں ماحول کے مطالعہ، استعمال اور تسخیر پر مجبور کرتا ہے۔یہ نظریہ مادہ کو ذہن میں تحلیل کرتا ہے۔یہ طریقہ انسان کو ماحول کا اتنا اثر نہیں سمجھتا جتنا کہ اسے ماحول بدلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

ماہرین نفسیات ابھی تک اوصاف کے تعین کے بارے میں کوئی فیصلہ شدہ فہرست مرتب نہیں کر سکے اور اُنہوں نے اِنسانی طبیعی حیات کا مطالعہ دو طریقوں سے کیا ہے۔

1۔ایک طریقہ ماحول سے شروع ہوتا ہے۔یہ طریقہ انسان کی شخصیت کو محض ماحول سے سازگار بننے کا آلہ سمجھتا ہے۔یہ نظریہ فکر اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر دیتا ہے اور مادی ثمرات کے اثرات سے ماحول کی کیفیت کی تبدیلی کی توجیہہ پیش کرتا ہے۔

2۔دوسرا طریقہ علم النفسیات کی رو سے شخصیت کا تعین داخلی کیفیتوں سے ابتدا کرتا ہے۔یہ طریقہ، انسان کو جبلتوں عادتوں اور احساسات کا نظام سمجھتا ہے جو انسان کو حوائج، محرکات اور خواہشات کے مربوط نظام میں باندھتا ہے اور ہمیں ماحول کے مطالعہ، استعمال اور تسخیر پر مجبور کرتا ہے۔شخصیت کا یہ نقشہ انسان کی حیوانی زندگی بسر کرنے پر مشتمل ہے۔جن میں کردار کو جبلی، لاشعوری اور غیر ارادی، میکانکی، انداز میں اپنایا جاتا ہے۔اس نقشہ میں انسان کے عقلی پہلو پر نہیں، بلکہ احساسی پہلو کی وضاحت ملتی ہے جن میں کئی جبلتیں اشیاء یا تصورات کے گرد منظم شکل میں جمع ہو کر عواطف کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً عاطفہ عشق میں کئی جبلتیں کارفرما ہیں۔مادری پدری تحریک، ہوس، جنسی آرزو، بزم آرائی و دیگر، محبوب کی شخصیت سے منظم طریقے پر وابستہ ہو جاتی ہیں۔

اِس ضِمن میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ بنیادی طور پر نباتات کی ضروریات کے لیے احتیاج کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جانوروں کے لیے اشتہا کا اور انسانوں کے لیے خواہش اور جذبات کا ہوتا ہے۔ نباتات میں صرف احتیاجات ہوتی ہیں۔ رجحان اور غایت دونوں کا شعور نہیں ہوتا۔ جانوروں میں احتیاجات اور اشتہا، دونوں موجود ہوتے ہیں اور رجحان کے شعور کا احساس بھی کسی قدر ہوتا ہے لیکن غایت کا علم نہیں ہوتا۔ انسانوں میں احتیاجات، اشتہا اور خواہشات تینوں ہی موجود ہوتی ہیں اور انسانی خواہش میں رجحان اور غایت دونوں کے متعلق شعور ہوتا ہے۔ وہ خواہشات پورا کرنے کے ذرائع کے بارے میں جائز اور درست کی تمیز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر پروفیسر میکینزی انسانی خواہش اور حیوانی اشتہا کے ذریعے انسان کے اندر انسانی اور حیوانی تقاضوں میں مندرجہ ذیل فرق بیان کرتا ہے۔

ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ وراثت کے نقوش انمٹ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں۔ ان نقوش کو ماحول کی تبدیلی سے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماحول اور وراثت کے نقوش وخصوصیات میں کوئی امتیاز نہیں۔ انسان کی ہر ایک عادت اور خصوصیت میں وراثت اور ماحول دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔

1۔ اشتہا میں غایت کا شعور نہیں ہوتا، جذبات/ خواہش میں غایتی شعور کا ہونا ضروری ہے۔ اس غایت کو حصولِ خیر کا ضروری ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

2۔ اشتہا جبلی اور فطری میلانات کا نام ہے، جذبات/ خواہش عقلی اور اکتسابی شے ہے۔

3۔ اگر خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو لذت کا موجب بنتی ہے اور اگر پوری نہ ہو سکے تو الم کا باعث، لیکن خواہش میں انسان کے لیے لذت والم اتنی اہم نہیں جتنی جانوروں کی اشتہا میں ہے۔ اس کی مثال روزہ دار کی بھوک اور پیاس کی تکلیف کسی غایت کے لیے برداشت کرنے میں بھی سامنے آتی ہے۔

علمُ النفسیات کا مؤقف ہے کہ یہ عقل وخِرد سے آزادانہ کام نہ کرنے والی طبیعی حانی زندگی جبر کے تحت گزاری جاتی ہے، جسے علم کے میدان میں تین گوشوں کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

☆ نظریہِ جبر کے تحت طبیعی/ حیوانی زندگی گزارنے کی منزل

جبر کے تحت طبیعی/ حیوانی زندگی گزارنے کے تین مؤقف ہیں۔

1۔ طبیعی/ حیوانی زندگی کا علم الحیات کا مؤقف

2۔ طبیعی/ حیوانی زندگی کا علمُ الانسان کا مؤقف

3۔ طبیعی/ حیوانی زندگی کا علمُ النفسیات کا مؤقف

1۔علم الحیات کی رو سے انسانی عادات وخصائل کے نقوش بچے کو نفسیاتی طور پر نہیں ملتے بلکہ جس طرح ایک بچہ مادہِ تولید کی وساطت سے اپنی رنگت وخط وخال، ماں باپ سے وراثت میں لیتا ہے اسی طرح اسے مادی طور پر ایسے اجزاء وراثت میں ملتے ہیں جنہیں جینز کہا جاتا ہے اور جن سے اس کا مزاج ترتیب پاتا ہے۔

اس نظریہ میں اب ذرا سی تبدیلی ہوگئی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ یہ اجزاء تولیدی درحقیقت خام مسالہ ہوتے ہیں۔اس سلسلہ پر ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے۔یعنی بچہ کا مزاج مرکب ہوتا ہے وراثتی مسالہ اور ماحول کے اثرات کا اور یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا ہے۔

اس میں ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ وراثت کے نقوش انمٹ ہوتے ہیں۔دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں۔ان نقوش کو ماحول کی تبدیلی سے بدلا جاسکتا ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماحول اور وراثت کے نقوش وخصوصیات میں کوئی امتیاز نہیں۔انسان کی ہر ایک عادت اور خصوصیت میں وراثت اور ماحول دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔

2۔علم الانسان کی رو سے انسانی بچے کے ذہنی نقوش، معتقدات وتصورات وغیرہ انفرادی چیز نہیں ہیں بلکہ نسلی ہیں۔ہر فرد کسی نہ کسی نسل سے متعلق ہے جس کی ابتداء قبائل سے ہوتی ہے۔نسلی معتقدات وتصورات وراثتاً آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اِنہی کے مجموعی تاثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص ورجحانات ہیں۔

3۔علمُ النفسیات میں نظریہ کرداریت کا بھی ایک اپنا مؤقف ہے جس کا امام ڈاکٹر واٹسن ہے۔اُس نے اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ جسے ہم نفسِ انسانی کا فیصلہ کہتے ہیں، وہ درحقیقت آزاد فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ مجموعی نتیجہ ہوتا ہے، ان تمام محرکات کا جو بچے کے (نفس) ذہن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔اِنہی محرکات سے نفسِ انسانی کی عادات وخصائل مرتب ہوتے ہیں اور پھر یہ عادات وخصائل نسلاً بعد نسل بطور وراثت منتقل ہوتے ہوئے غیر شعوری طور پر مسلمات یا معتقدات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔بنا بریں جس چیز کو عام طور پر نفسِ انسانی کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ان ہی محرکات کا طبیعی نتیجہ ہوتا ہے۔

جب بھی جِبلی میلانات اپنی جبلتوں سے متاثر اور مشتعل ہوکر زیادہ فعال ہونے کے مُرتکب ہوتے ہیں، تو اُن کے احساسات کی تبدیلی کو نفسیات میں ہیجان کا نام دیا جاتا ہے۔لہٰذا یہاں اِس کا علمِ نفسیات کی رو سے مُختصر جائزہ پیش کیا ہے

☆جبلتوں سے مشتعل اِنسان کی ہیجانی زندگی میں کیفیت:

جدید حکمائے نفسیات ہیجان کو جبلت کا احساسی پہلو کہتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ ہیجان جبلت ہی کے مشتعل ہونے پر معرض وجود میں آتا ہے۔چنانچہ ہر ہیجان کی بنیاد جبلی ہوتی ہے۔اس لیے انھوں نے ہر جبلت کے بالمقابل مشتعل ہونے پر ہیجان کو درج ذیل بدلتی حالتوں سے واضح کیا ہے۔

1۔ جبلت فرار سے مشتعل حالتِ ہیجان کی خوف میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
2۔ جبلتِ تنفر سے مشتعل حالتِ ہیجان کی کراہت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
3۔ جبلت تجسس سے مشتعل حالتِ ہیجان کی حیرت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
4۔ جبلت نزاع پسندی سے مشتعل حالتِ ہیجان کی غُصہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
5۔ جبلت خودادعائی اور تحقیرِ نفسی سے مشتعل حالتِ ہیجان کی برتری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
6۔ والدینی جبلتِ ترحم سے مشتعل حالتِ ہیجان کی کمتری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
7۔ جبلتِ جنس سے مشتعل حالتِ ہیجان کی شہوت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

اوپر کی مثال سے واضح ہوتا ہے کہ جبلت ذہن کا ایک مستقل رجحان ہے مگر ہیجان ایک عارضی کیفیت ہے۔ اس سے مراد عضو کی ایسی برانگیختہ کیفیت ہے، جس میں خود اختیاری نظام عصبی (غدود، عضلات) درجہ اعتدال سے زیادہ فعال ہوتے اور مخصوص قسم کے جسمانی مظاہر مثلاً خون کے دباؤ، حرکت قلب اور تنفس میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس سے مراد احساسات کا فوری شدید اُبال جو محرک کا کام کرتا ہے۔

احساس کی جبلت سے مشتعل ایسی ہیجانی کیفیت کی زندگی کے لئے قرآنی اصطلاح الھوٰی سے وضاحت کی گئی ہے۔

امام راغب نے الھوی کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے کئے ہیں۔ اس کے معنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں اور جو نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو اسے ھَوِیٌ کہہ دیتے ہیں کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کو اس کے شرف و منزلت سے گرا کر مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

> جو لوگ اپنے جبلی جذبات پر اپنی عقلِ فعال سے قابو نہیں کر پاتے، ایسی حالت میں کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ
> وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (7:176)
> ''اگر وہ ہماری مشیت کے مطابق چلتا، تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے، لیکن ذاتی ہیجانات پر مبنی علم کے تحت وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں (ارض) کے ساتھ چمٹا رہا''۔

قرآن سے بھی ہمیں اس حیوانی زندگی ہیجان کی کچھ تفصیل اھواء کی شکل میں ملتی ہے۔ جو اس کے جبلت سے مشتعل بلا لگام لاشعوری ہیجانی کیفیات پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم میں اس کی وضاحت ہے کہ انسانی خواہشات اگر وحی کے تابع نہ ہوں، تو ایسے احساسی پہلو سے مشتعل ہیجانی/اھوائی کیفیات کا حقیقت تک رسائی حاصل کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:119)

''ایسے لوگوں میں سے بیشتر وہ ہیں، جنہیں اپنے ذاتی ہیجانی روش پر چلنے کی بنا پر علم (وحی) کی سند حاصل نہیں ہوتی اور

وہ لوگوں کو صحیح راستے سے بہکا دیتے ہیں''۔

جو لوگ اپنے جبلی جذبات پر اپنی عقلِ فعال سے قابو نہیں کر پاتے، ایسی حالت میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (7:176)

''اگر وہ ہماری مشیت کے مطابق چلتا، تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے، لیکن ذاتی ہیجانات پر مبنی علم کے تحت وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں (ارض) کے ساتھ چمٹا رہا''۔

قرآن یہاں وضاحت کر رہا ہے کہ اللہ کی خواہش کے برعکس، ان میں اکثر اپنی سرکش خواہشات کا اتباع کر کے زمین کی پستیوں کے ساتھ جا چپکتے ہیں۔ لہٰذا قرآن مومنین کو ہدایت کرتا ہے کہ جب تمہارے پاس وحی کی روشنی میں واضح راستہ سامنے آ گیا ہے تو ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون جو اللہ کی ہدایت کے برعکس اپنی ہیجانی خواہش پر چلے قرآن ان کے درجات بلند بتلاتا ہے، جو خدا کی طرف سے علم و برہان کے مطابق چلے، ان کے مقابل میں جو اپنی خواہشات کا اتباع کرے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (47:14)

''کیا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے، جو خدا کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں سیدھے راستے کی طرف جا رہا ہو، اس کے مقابلہ میں جو بُرے اور بھلے کی تمیز کھو کر اپنے ہیجانی جذبات کا اتباع کرے''۔

یہاں قرآن الانسان کی اس حالت کا نقشہ سامنے لا رہا ہے۔ جب وہ حیوانوں کی مانند اپنی جبلتوں کے احساس سے مشتعل ہو کر ہیجانی زندگی گزارتا ہے، جس میں نہ تو وہ عقل سے کام لیتا ہے اور نہ ہی اپنی آزادیِ ارادہ سے اپنے جذبات کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔

☆ قرآن میں ہیجانی کیفیت میں عقل سے کام نہ لینے والی الانسان کی حالت کا نقشہ

> جو لوگ علم الحق کی راہ نمائی کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں، ایسے الانسان کو علی حالہٖ بے باک چھوڑ دیا جائے، تو یہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی الانسان کا لفظ آئے گا تو اس کے معنی ہیں ''وہ انسان/قوم، جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہاں اِس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر انسان کے سامنے وحی کی روشنی نہ ہو تو وہ ''کَنُود'' بن جاتا ہے۔ اِس لفظ کے معنی ہیں وہ جو سب کچھ اکیلا ہی کھا جائے اور دوسروں کو کچھ نہ دے۔

ہمیں قرآن سے راہنمائی ملتی ہیں کہ انسان حیوان سے بتدریج ترقی کرتا ہوا، انسانی پیکر میں آیا ہے۔ جب انسان کا شعور خام تھا تو وہ اپنی جبلتوں سے مشتعل ہیجانات پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اِس کی وضاحت میں ارسطو کا قول ہے کہ انسانی بچپن کی زندگی اور حیوانی زندگی کی روح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اِس لئے کہ بچپن کی حالت میں جب جبلت کے احساسی پہلو سے مشتعل ہوکر ہیجان کے تابع چلے تو الانسان کی حالت جانوروں جیسی ہوجاتی ہے۔ قرآن نے اِس کی ہیجانی صِفات میں مبتلا ہونے کی اِنسانی حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے اُس کی زندگی کا نقشہ اِس طرح کھینچا ہے کہ:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ (100:6) اِنسان اپنے رب کا کنود ہے۔

جولوگ علم الحق کی راہ نمائی کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں، ایسے الانسان کو علٰی حالہٖ بے باک چھوڑ دیا جائے، تو یہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی الانسان کا لفظ آئے گا تو اس کے معنی ہیں ''وہ انسان/قوم، جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہاں اِس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر انسان کے سامنے وحی کی روشنی نہ ہو تو وہ ''کَنُود'' بن جاتا ہے۔ اِس لفظ کے معنی ہیں وہ جو سب کچھ اکیلا ہی کھا جائے اور دوسروں کو کچھ نہ دے۔ ایسی حیوانی زندگی گزارنے والے قرآن کی اصطلاح میں الانسان کی زندگی کی قرآن نے وضاحت کی ہے کہ

وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ (103:1-2)

زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ الحق کی راہنمائی کے بغیر زندگی بسر کرنے والے انسان، بلاشبہ ہمیشہ خسارے اور نقصان ہی میں رہے ہیں۔

الۡعَصۡرِ سے مراد پوری نوع انسانی کی تاریخ ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہر موجودہ دور کی تاریخ، اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ سارے قرآن میں سابقہ اقوام نوحؑ، عاد وثمود، مدین، لوطؑ، بنی اسرائیل، فرعون وغیرہ کی تفاصیل پھیلی ہوئی ہیں۔ اس آیت میں لفظ العصر سے سابقہ تباہ ہونے والی اقوام کی طرف اشارہ کر کے، ان کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ دیکھ لو، جن اقوام نے ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہ کی تھی، تو وہ کیسے خسارے میں رہیں، تباہ و برباد ہوئیں۔ لہٰذا آئندہ بھی، جو اقوام ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گی، ان کا بھی وہی حشر ہوگا، جو گزشتہ اقوام کا ہو چکا ہے۔ اِس خسارے کی زندگی میں الانسان کی صِفات کی نشاندہی قرآن میں یوں کی گئی ہے کہ

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ (96:2) ''انسان کو علق صفت کے ساتھ پیدا کیا''

یعنی چپکنے، چمٹنے والی خصوصیّت دے کر پیدا کیا۔

دوسرے مقام پر آیا ہے:

خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ (21:37) ''انسان کو جلد باز پیدا کیا۔''

عجل سے ہی ہمارے ہاں عجلت کا لفظ ہے۔ایک اور مقام پر آیا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (30:54)

''تمہیں کمزور پیدا کیا''۔

مِنْ عَلَقٍ، مِنْ عَجَلٍ اور مِّنْ ضُعْفٍ کے یہ معنی نہیں کہ ''تمہیں چپکنے سے پیدا کیا''، ''تمہیں جلد بازی سے پیدا کیا'' اور ''تمہیں کمزوری سے پیدا کیا''۔ ''من'' کہہ کر خدا نے انسان کی حیوانی خصوصیات بیان کی ہیں یعنی ''تمہیں چپکنے چمٹنے والی خصوصیّت دے کر پیدا کیا''، ''تمہیں جلد باز پیدا کیا'' اور ''تمہیں کمزور پیدا کیا''۔حیوانی سطح پر انسان کی زندگی، وہی جبلّتیں اپنے اندر رکھتی ہے، جو عام طور پہ حیوانات کی ہیں۔

حیوانات میں ''زندگی کا تحفظ'' Self Preservation ایک بڑا بنیادی جبلّی تقاضا ہے۔اس تقاضے کی رو سے جس سے متعلق اس کی زندگی ہوتی ہے، انسان ہر اس شے کے ساتھ چپک جاتا ہے۔لہٰذا انسان کو یوں چپکنے والا بنایا کہ یہ ہر اس چیز سے چپک جاتا ہے، جس سے متعلق اس کی زندگی ہوتی ہے یعنی ہر وہ شے، جس سے اس کی زندگی کا تحفّظ اور سامان زیست وابستہ ہوتا ہے، وہ اِسے چھوڑنا ہی نہیں چاہتا۔اِسی خلقت کے جبلی خصائص کی انسان میں یوں بحق نشاندہی گئی ہے۔

4۔وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ (17:11)

انسان بھلائی کی بجائے ان چیزوں کو آواز دے دے کر بلاتا ہے جو اس کے لیے برائی کا موجب ہوں۔

5۔وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (17:67)

''انسان بڑا ناشکر گزار ہے''۔

6۔وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ (17:100)

''انسان بڑا تنگدل واقع ہوا ہے''۔

7۔اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ (33:72)

''یہ بڑا ظالم اور جاہل ہے''۔

8۔وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)

''(الحق کا) کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔اور جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں۔''

سورہ المعارج (70:18۔21 المعارج) میں ترتیب وار اسی الانسان کی چار مزید صِفات کا ذکر کیا گیا ہے۔وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ (70:18۔21)

اِنہیں ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے۔

9۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی

وہ مال کو تھیلی میں رکھ کر جمع کرتا ہے۔

10۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا

پیدائشی طور پر تنگ دل اور بے صبرا ہو جاتا ہے

11۔ ذرا سی تکلیف پہنچے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔

12 وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (70:18۔21 المعارج)

جب مال ہاتھ آ جائے تو کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔

سورہ الدھر میں مزید صِفات کا ذکر ہے کہ:

13۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا (76:27)

''انسان پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لپکتا ہے۔ (عاقبت اندیشی سے کام نہیں لیتا) اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں''۔

14۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ (98:6)

(انسان کو بہترین ہیت کذائی میں پیدا کیا) لیکن یہ لوگ تمام مخلوق سے بدتر ہیں۔

15۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (100:6۔8)

انسان، ربوبیت خداوندی کا ناشکر گزار ہے۔ مال و دولت کی محبت اس پر غالب رہتی ہے۔ وہ سب کچھ اپنے ہی لیے سمیٹ لینا چاہتا ہے۔

16۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (18:54)

بے شک انسان اکثر جھگڑے نکالتا رہتا ہے۔

17۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ (96:6)

''یہ انسان بڑا ہی سرکش واقع ہوا ہے''۔

ایسی حالت میں وہ اپنی ذات ہی کا مُنکر ہوتا ہے اور اِسی لئے حیوان، بلکہ حیوان سے بھی بدتر کیفیت کا حامل قرار گیا ہے۔

جبلی، لاشعوری اور غیر ارادی میکانکی انداز حیوانیت کی روشن سے ہٹ کر جب ہم جبلی، شعوری اور ارادی انسانی اعمال کی بات کرتے ہیں۔ تو ماہر نفسیات اسے اِنسان کے عقلی پہلو جذبات کے دائرے کی شکل میں سامنے لاتے ہیں۔ اِسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔

☆علم النفسیات کی رو سے انسانی زندگی کا عقل سے قابو پا کر جذبات کے مقام تک رسائی:

اس کے اصطلاحی مفہوم میں، ان تاثرات و ہیجانات کی تنظیم ہے جو کسی شے یا تصور سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ جذبے کے اس عقلی تنظیم کے اس قدر قائل ہیں کہ ان کا دعویٰ ہے کہ جس شے سے جذبہ متعلق ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک فکری یا تصوری شے ہوتی ہے نہ کہ مادی۔ جذبے کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ جذبہ کسی مخصوص شے کے متعلق ذہن کی ایک مرکب اور کم وبیش مستقل حالت ہے، جس میں انسان اس شے سے متعلق کسی مخصوص ہیجان کی طرف میلان رکھتا ہے۔

انسان کی حیوان سے تمیز کرنے کے لیے سپائی نوزا، جذبات کی مزید تقسیم کر کے، انسانی رویہ کی وضاحت کرتا ہے۔

1۔ منفعل جذبات وہ ہیں جن کی علتوں کا ہم فہم نہیں رکھتے، بلکہ ہم پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اور جس کی علت جزوی طور پر ہمارے خارج سے تعلق رکھتی ہے، یہ غیر معتدل اور ناموزوں ہوتے ہیں۔

2۔ فعال جذبات جو منفعل جذبات کے برعکس ہمارے علم اور شعور سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ انسان کو حیوانوں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ ہمارے وجود میں رونما ہونے والی تبدیلی کی مکمل علت ہمارے اندر موجود ہوتی ہے۔

فعال جذبات کو سپائی نوزا مزید دو بڑی مدّات میں تقسیم کرتا ہے۔

1۔ ایک عقلی حُبِ نفسی، جو شہوت یا اشتہائے نفس سے تعلق رکھتی ہے، جو انسان کو حیوانی زندگی گزارنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ صرف ہماری ذات کے تحفظ کا احساس رکھتی ہے۔ اس کے لئے ایثارِ ذات مطلقاً ناممکن ہے۔

2۔ دوسری عقل فیض رسانی جو سخاوت کہلاتی ہے اور انسانوں کو غلامی سے نکال کر آزادی عطا کرتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق کوئی جذبہ ہی دوسرے جذبے کو ہمارے ذہن سے نکال سکتا ہے۔ چنانچہ منفعل جذبات کو شکست دینے اور مار بھگانے کے لیے فعال جذبات ہی کارآمد ہو سکتے ہیں۔

میکڈوگل نے جذبات کے متعلق درج ذیل رائے دی ہے جس کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

افراد اور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث ہوتے ہیں۔ جذبات کے بغیر ہماری ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہو گی۔ یعنی تنظیم (Order) توافق (Consistency) اور تسلسل (Continuity) کے بغیر ہو گی اور ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، ناقابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔ جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔ علاوہ بریں خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔ اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔

میکڈوگل کے اِس قدرے طویل تصورِ جذبات کے تجزیہ سے درجِ ذیل صلاحیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

1۔افراداور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔

2۔جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث ہوتے ہیں۔

3۔جذبات کے بغیر ہماری ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہوگی۔یعنی تنظیم،توافق،اور تسلسل کے بغیر ہوگی۔

4۔ ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، نا قابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔

5۔جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔

6۔خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔

7۔اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔

عِلمُ النفسیات میں جذبات کی اہمیت یوں سامنے آتی ہے کہ ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں جس طرح انسان میں عقل وشعور،فہم وادراک اور قوت کی مختلف صلاحتیں ہیں۔اسی طرح جذبات بھی ایک صلاحیت کے مظہر ہوتے ہیں اور یہ صلاحیت بڑی اہم ہے اس لیے کہ انسانی عمل (کام) کے محرک اس کے جذبات ہی ہوتے ہیں۔عصر حاضر کے ماہرینِ نفسیات البتہ کہتے ہیں کہ نفس بطورِ وحدت کام کرتا ہے۔اصل میں اعمال کے اسباب خلقی واکتسابی رُجحانات ہیں اور عقل کا کام ان کی راہنمائی ہے۔اصلی محرک عالم جذبات ہے جو ارادوں کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور یہی صدورِ افعال کا باعث ہے۔علم النفسیات میں حیوان سے انسان کی ارتقائی منزل میں قدم رکھنے کو جبلت سے مُشتعل ہیجانی روش پر اِنسانی عقل سے جذبات کے تحت قابو میں رکھنے سے مشروط کیا ہے۔اگر ایسا نہ کیا جائے تو اِنسان حیوان کے درجہ ہی میں رہتا ہے۔

یہاں حیوان اور انسان میں فرق ظاہر ہوجاتا ہے کہ حیوان میں جبلت خود ہی عقل کا فریضہ انجام دیتی ہے، جبکہ انسانی عقل جِبلت پر قابو پا کر ان میں انتخاب کرنے پر قادر ہے۔جب انسان عقل بالقوت یعنی جبلتوں، ہیجانات اور عادتوں کو، عقل کے ذریعے جذبات کی شکل میں انتخاب کرتا ہے تو اسی عقل فعال کی بدولت اس کا حیوان سے انسان کی سمت ارتقاء ہونا شروع ہوجاتا ہے۔اس کے برعکس اگر وہ عقل فعال (جو اسے حیوان سے علیحدہ کرتی ہے) سے کام نہیں لیتا تو وہ منطق کی رو سے حیوان کے درجے میں ہی رہتا ہے اور اس طرح ارتقاء سے محروم رہتا ہے۔

عِلمُ النفسیات میں جذبات کی اہمیت یوں سامنے آتی ہے کہ ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں جس

طرح انسان میں عقل وشعور، فہم وادراک اور قوت کی مختلف صلاحتیں ہیں۔ اسی طرح جذبات بھی ایک صلاحیت کے مظہر ہوتے ہیں اور یہ صلاحیت بڑی اہم ہے اس لیے کہ انسانی عمل (کام) کے محرک اس کے جذبات ہی ہوتے ہیں۔

علم النفسیات میں حیوان سے انسان کی ارتقائی منزل میں قدم رکھنے کو جبلت سے مُشتعل ہیجانی روش پر انسانی عقل سے جذبات کے تحت قابو میں رکھنے سے مشروط کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو انسان حیوان کے درجہ ہی میں رہتا ہے۔

نفسیات کے ماہرین نے وضاحت کرتے ہیں کہ اِنسان ہونے کی اہلیت کے ثبوت میں سب سے پہلا لازمی امر ہے کہ وہ جذبات کو عقل وفِکر سے جِبلت سے مشتعل ہیجانات پر اپنا کنٹرول ظاہر کرے۔ اِس لئے کہ ایسا مکمل اختیار رکھتے ہوئے موزوں جبلت کا انتخاب کرنے کے لئے انسان اپنی فہم سے کرنے کا اختیار کی صلاحیت کی ودیعت رکھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔

ہیجانات پر قابو پانے کی صلاحیت کے علاوہ انسان کو عقل کی صلاحیت سے ودیعت کیا گیا ہے۔ عقل اور جذبات کی وضاحت میں قرآن نے دو اصطلاحات قلب اور افئِدۃ استعمال کی ہیں، جن کا ترجمہ ہم ''دل'' ہی کرتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ قلب Mind کا وہ حصّہ ہوتا ہے، جو سمجھنے کی صلاحیّت رکھتا۔ قلب، سمجھے یا نہ سمجھے، سمجھنے کی صلاحیّت کو کام میں لائے یا نہ لائے بہرحال قلب میں یہ صلاحیّت ہوتی ہے۔ یہ Mind کا وہ پہلو ہے، جس میں کچھ سمجھنے کی کیفیّت ہوتی ہے۔ فوٴاد یہ Mind کا وہ حصہ ہے، جس کا تعلق صرف انسانی جذبات سے ہوتا ہے۔ اس کے معنی سوز وگداز کے ہوتے ہیں۔ جمع کرنا، گِننا، نفرت، حقارت، حسد، دوسروں کو کچوکے دینا یہ ساری چیزیں جذبات پر مبنی ہیں۔ ان تمام میں قلب یعنی سمجھنے والی صلاحیّت کا کچھ تعلق نہیں ہے۔ ان تمام چیزوں کا فہم، ادراک، سوچ، سمجھ (دلیل) سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں فوٴاد یعنی جذبات سے متعلق ہیں۔ اس لئے کہ آگے کے ارتقائی سفر کا آغاز پہلی منزل میں حیوانی جبلتوں پر مشتمل ہیجانات کو جذبات سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔

اِس ضمن میں سپپائی نوزا جذبات کی دو اقسام کو سامنے لاتا ہے:

1۔ منفعل جذبات:

یہ وہ ہیں جن کی علتّوں کا ہم فہم نہیں رکھتے، بلکہ ہم پر مسلط ہوجاتے ہیں۔ اور جس کی علت جزوی طور پر ہمارے خارج سے تعلق رکھتی ہے، یہ غیر معتدل اور ناموزوں ہوتے ہیں۔ انہیں حیوانی جذبات کہا جاتا ہے۔

2۔ فعال جذبات:

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ارادی انضباط کرنے سے پہلے اِس کو ممکن العمل بنانے کے لئے سمجھ کی ضرورت ہوتی ہے، جو

ہمارے علم اور شعور سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہمارے وجود میں رونما ہونے والی تبدیلی کی مکمل علت ہمارے اندر موجود ہوتی ہے۔ یہ انسانی جذبات کہلاتے ہیں اور یہ انسان کو حیوانوں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔

فعال جذبات کو سپائی نوزا مزید دو بڑی مدّات میں تقسیم کرتا ہے۔

1۔ ایک عقلی حُبِ نفسی، جو شہوت یا اشتہائے نفس سے تعلق رکھتی ہے، جو انسان کو حیوانی زندگی گزارنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ صرف ہماری ذات کے تحفظ کا احساس رکھتی ہے۔ اس کے لئے ایثارِ ذات کی صِفت اختیار کرنا مطلقاً ناممکن ہے۔ اِسے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں عقلِ مفادِ خویش کہا ہے۔

2۔ دوسری عقلِ جہاں بین جو فیض رسانی کی وجہ سے سخاوت کہلاتی ہے اور انسانوں کو غلامی سے نکال کر آزادی عطا کرتی ہے۔ سپائی نوزا بھی یہی نظریہ رکھتا ہے کہ کوئی جذبہ ہی دوسرے جذبے کو ہمارے ذہن سے نکال سکتا ہے۔ چنانچہ منفعل جذبات کے حُبِ نفسی کو شکست دینے اور مار بھگانے کا کام عقلِ فیض رسانی کے فعال جذبات سے ہی ہو سکتے ہیں۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیوان اور انسان کے فرق کو حیوانی اشتہات اور انسانی خواہشات کے ذریعے سامنے لایا جائے۔ بنیادی طور پر نباتات کی ضروریات کے لیے احتیاج (Want) کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جانوروں کے لیے اشتہا (Appetite) کا اور انسانوں کے لیے خواہش (Desire) کا۔ نباتات میں صرف احتیاجات ہوتی ہیں۔ رجحان اور غایت دونوں کا شعور نہیں ہوتا۔ جانوروں میں احتیاجات اور اشتہا، دونوں موجود ہوتے ہیں اور رجحان کا شعور بھی کسی قدر ہوتا ہے لیکن غایت کا علم نہیں ہوتا۔ انسانوں میں احتیاجات، اشتہا اور خواہشات تینوں ہی موجود ہوتی ہیں اور انسانی خواہش میں رجحان اور غایت دونوں کے متعلق شعور ہوتا ہے۔ وہ خواہشات پورا کرنے کے ذرائع کے بارے میں جائز اور درست کی تمیز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر پروفیسر میکینزی خواہش اور اشتہا کے ذریعے انسان اور حیوان میں مندرجہ ذیل فرق بیان کرتا ہے:

1۔ اشتہا میں غایت کا شعور نہیں ہوتا، خواہش میں غایتی شعور کا ہونا ضروری ہے۔ اس غایت کو یا تو خیر سمجھا جاتا ہے یا حصولِ خیر کا ضروری ذریعہ۔

2۔ اشتہا جبلی اور فطری میلانات کا نام ہے، خواہش عقلی اور اکتسابی شے ہے۔

3۔ اگر خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو لذت کا موجب بنتی ہے اور اگر پوری نہ ہو سکے تو الم کا باعث، لیکن خواہش میں انسان کے لیے لذت و الم اتنی اہم نہیں جتنی جانوروں کی اشتہا میں ہے۔ اس کی مثال روزہ دار کی بھوک اور پیاس کی تکلیف کسی غایت کے لیے برداشت کرنے میں سامنے آتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے میکڈوگل کے درج ذیل جبلی نظریات سے روح قرآن سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے اتفاق کیا ہے۔

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

- پاکستان میں سبز انقلاب کا آنے والا دور:
- اَلْمَآءَ (56:68)، سَحَابًا ثِقَالًا (7:57)، اَلْبِحَارُ سُجِّرَتْ (81:6)
- طِيْنٍ (7:12،6:2)، طِيْنٍ لَّازِبٍ (37:11)
- وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا (80:30)، اَعْنَابٍ (36:34)، رُطَبًا جَنِيًّا (19:25)، سِدْرٍ (56:28)، الزَّيْتُوْنِ (95:1)، نَّخِيْلٍ (36:34)، الرُّمَّانَ (6:141)، كُلِّ الثَّمَرٰتِ (16:11)، اَلْمَرْعٰى (87:4)، حَبًّا (36:33)
- باغبان ایسوسی ایشن کے ممبران سے پُرزور استدعا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ شجر کاری میں حصہ لیں۔ اور ہر ممبر کم از کم 10 پودے ضرور لگائے۔ بنجر رقبہ میں شجر کاری کریں۔
- پھل دار پودے دوسروں کو عطیہ کریں جنگلات کو آگ سے بچائیں۔
- پانی کی سہولت کے لئے امداد دیں، تعاون کریں۔

ملک حنیف وجدانی سابق کونسلر، ریٹائرڈ ٹیچر سکاؤٹ ٹرینڈ ٹیچر صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیّداں۔ نیومری
فون نمبر: 0310-1547355

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع





اب طلوع اسلام کی تمام بُکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین
فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے
علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔

فون نمبر:
0322-6386991

حکیم عبدالمجید
ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1، محلہ فتح آباد، فیصل آباد

Is Sexual Relationship a Private Matter?

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

By the way, a member of Jamiat-e Ulama-e Islam declared in the spring 1973 session of Pakistan Parliament that banning slavery is against Islam; and if one does not have the wherewithal to afford more than one wife then he should be allowed to have a concubine. [Pakistan Times, March 1, 1973]

We were talking about what kind of Islam is being taught to students. When a question was put to Mr. Maududi that if an adult man is not able to get married and his sexual energy is at its peak which drives him crazy then can he do masturbation to avoid sin of fornication. We already saw what the answer of the Quran was – that he should practice self-control (24:33). But Mr. Maududi replied: Although masturbation is haram but since fornication is a higher level of sin, so the intellect teaches that to avoid a bigger sin it is ok to do a lesser sin. So, doing masturbation is okay if there is chance to commit a bigger sin of fornication. Perhaps God will not punish him. [Rasaayel-o-Masaayel, page 202]

Another example Mr. Maududi provides as follows regarding temporary Nikah:

Assume that a ship crashes in sea and a man and woman are on a ship's broken plank which floats on the sea and lands on the shore of an islandthat does not have any population. Both are forced to live on the island and according to sharia it is not possible for them to do

Nikah without witnesses. So, there is no way for them except to mutually agree and do a temporary Nikah among themselves until they reach a populated area. Therefore, Muta'a (sharia terminology for temporary Nikah) is for this type of emergency situation. [Tarjumanul Quran, August 1955]

As it is clear, Mr. Maududi does not even believe in the concept of self-control. To satisfy sexual desire sometimes he suggests masturbation and other times he suggests temporary marriage (Muta'a). Allah gave permission to eat haram food during emergency situation, not for satisfying sexual desire. But Mr. Maududi suggests to satisfy sexual desire during stressful situation. It implies from his suggestions that Allah didn't fully know about sexual instinct that emergency situation may develop; and that is why Allah didn't suggest any remedy for it. This shortcoming Mr. Maududi fulfilled it.May Allah protect us from such scholars!

Proceeding further

This is the religious teaching that is provided to students who come to so-called sacred religious schools in order to protect themselves from the evil viruses floating in the open college environment. But Mr. Maududi does not step there. He tells youth that a man can marry four women without any restrictions;and whenever he wants he can divorce a wife by saying Talaq-Talaq-Talaq and marry another woman in her place. The famous author Robert Briffault in his book (The Mother) mentions that a Kurd married forty women but had only one wife at a time. And there was no objection from the custodians of sharia since he did it according to sharia. Mr. Maududi strongly opposed the family law when it was being implemented in Pakistan. He argued that how can

government put restrictions in matters of sexual freedom. The family law was meant to provide equal rights to women as the Quran advocates;and it also included that non-adult girls cannot be married. Mr. Maududi objected against it and wrote in the October 1969 issue of his monthly magazine Tarjumaanul Quran: that not only it is allowed to marry non-adult young girls but it is also allowed to copulate with them. May Allah protect us!

These people bring proof of marrying young girls from Bukhari's hadith which says that the Prophet (PBUH) married 'Aisha (R) at the age of six and she started living with the Prophet (PBUH) at the age of nine.I provided solid proof from history that this is a fiction propounded by the enemies to malign Islam and the Prophet (PBUH); and that "Aisha (R) was married to the Prophet (PBUH) between the age of seventeen and nineteen. At this our religious custodians sharia pronounced the fatwa of Kufr against me because my proof proved the Bukhari's hadith wrong.These people don't care about maligning Prophet's character but they do care about Imam Bukhari and cannot even accept any criticism about his hadith!

The Quran has described the realm of Jannah in a very subtle and sensitive way and that too mentioning it only as an analogy because human mind cannot grasp the reality of paradise with its present consciousness. But to religious custodians it is also full of sensualrealm. Mr. Maududi writes:

Whether women die young or old but all the pious women who will enter Jannah will be transformed into beautiful bachelorettes. [Tafheemul Quran, Vol. 5, page 268]

The girls of non-Muslims who died young before reaching adulthood will be made into Houries and they will always remain young girls for the pleasure of men of Jannah. [Tafheemul Quran, Vol. 4, page 287]

And these Houries will be beside the wives of Jannah. The wives will remain in palaces with their husbands. But when men will go out for picnic then there will tents all around in which there will be Houries for their pleasure and enjoyment. [Tafheemul Quran, Vol.5, page 35]

This is the description of Jannah provided by our religious scholars that is taught to students. They blame woman's freedom for our youth's unrestrained sensual desires. They don't understand that the fundamental reason for this is the teaching that is offered to them in the name of religion. As we have seen earlier, sexual emotion is driven by thoughts.

If the thoughts of our youth are purified, then the door of uncontrolled sexual instincts will be closed. On the contrary, blatant pornographic material is being taught to our youth in religious schools. And the literature that comes from the West is full of obscenities. This is the reality. But then everyone is worried that the atmosphere is full of amatory. Under the situation if this wouldn't happen, then would have happen: Piety? Dr. Unwin tells about it after extensive research:

"The peoplepossess the power of reason, but they do not apply it to the world of theirexperience. Thus they do not inquire into the causes of things; they acceptwithout question that assembly of activities which we callNature. On all matters of human interest their opinions are uniform; thesociety contains no cultural strata. In

any unusual or uncomprehendedevent or phenomenon the people see a strange quality or power which theyregard as both dangerous and desirable. This quality or power is called bythe same name wherever and whenever it is manifest. It is exhibited byany stone, tree, or animal of uncommon type or unusual appearance, andby any article the nature of which is not understood; any man whosemanner of birth or life is in any way extraordinary is credited with itspossession; it is manifest also in his corpse, and in the corpse of any manwhose manner of death is abnormal. Strangers are not thought of as men,but as beings who possess the power manifest in all strange, uncomprehendedthings. A sickness which comes within the normal experience ofthe people is treated in what the people consider a normal manner, but anunaccountable sickness is ascribed either to the power responsiblefor all unaccountable things or to a man who, possessing that power,has employed it for his own purposes.”“Generation after generation the same tradition is handed on; the same ideasprevail. Time does not alter them. In such a society human beings areborn; they satisfy their desires; they die. And, when their corpses havebeen disposed of, they are forgotten.The social vision of such a human society is not very different from that of any other group of gregarious mammals.” [Page 345-346]

Did you see the picture of a society in which sexual opportunity is kept loose? For centuries this has been the condition of Muslims. This is what our sharia has done to Muslims. When sexuality was limited within the boundary of the Quran then this nation overpowered the entire world. When Malukiyyah took over and let loose the sexuality virus then everything started happening in the

name of sharia which the Quran wants to stop. The result was that their creative energy was lost. Neither the depth in thought remained nor did the power of higher deeds remain. And this condition is continuing until today.

***

The last word

Lastly, I want to address our youth: it is no doubt that our environment is polluted with the malevolent virus that produces incitement for amatory desires. But we have seen that amatory desires never happen automatically. These happen with human's own thoughts. That is, these amatory drives happen only when one wants to. Allah has given humans the willpower to control their thoughts and wishes. So, don't think about this malevolent environment. Just use your willpower to control your feelings and desires.

How we can control our thoughts so that this amorous feeling does not arise in our hearts?Let me explain this through an example. Consider a boy who is vagabond and flirts with girls all the time.He has a beautiful sister. He comes home. Both he and his sister sleep in the same room. But he never develops any sexual feelings for his sister. Why is that? Because since childhood it has been drilled into his mind that it is not proper to have sexual relationship with your sister. This thought has gone deep into his subconscious mind and has turned into an ideology. And therefore, he has no sexual feeling for his sister for his entire life. Sometimes, we do hear some cases where someone has sexually molested his sister or his daughter. But these are cases which happen because of mental insanity or sickness. Common people don't do it.

This subconscious feeling, of having no sexual relationship between brother and sister, is not limited to only our society but also in Western society, where the environment is even worse. There was a case in America that appeared newspapers. It was about a couple married for about ten years and they had three children. The details of the story is: that during the war an English couple died who had two children – a boy and a girl. A Canadian soldier took the boy to Canada and an American soldier took the girl to America. Both families adopted them. The boy grew up in Canada and the girl grew up in America. It so happened that the boy was visiting America and met that girl. Both liked each other and got married and had three children. Canadian and American soldiers found out that these were the same boy and the girl that they had brought them from England and told them that they are brother and sister. That is when the news broke and the boy and the girl(now husband and wife) felt very bad and started crying endlessly. Then some clergy consoled them and after that they started living as brother and sister.

So, why they felt so bad? It was exclusively due to the thought that brother and sister cannot be husband and wife although Persian kings used to marry their sister openly. This is the extraordinary power of thought that goes into the subconscious mind which can easily control all kinds of evil thoughts.

This story was of a real brother and sister. The Quran goes one step further and says that every boy and girl's relationship is like brother and sister and it changes only when a boy and a girl do the Nikah and become husband and wife. When the Quran says: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ(49:10) – then it does not just mean that only Momineen men are like brothers. It also means that the relationship between

every Momin Men and every Momin women is like brother and sister excepting those who have tied the knot of Nikah.

As you know, the period of Arab Jahhiliyyah was full of intensely amorousenvironment among other malevolent evils. The Momineen came from this evil environment. The Prophet (PBUH) transformed their hearts and minds with Quranic teaching and training. This way these brand new Momineen reached the pinnacle of Quranic character. This way they were cleansed of all the evils including the deeply entrenched amorous evil; and the reality set deeply in their minds that all men and women (except married couples) are brothers and sisters as part of their Iman. Because of this Iman, there remained no trace sexual licentiousness in them at all. And we are now in the Jahiliyyah period in which the Arabs were living before the Prophet (PBUH). Therefore, the same technique – i.e., proper teaching and training in the light of the Quran that every boy and girl are brothers and sisters as part of Iman – must be applied to cleanse the society of all the inebriatedevils that the Prophet (PBUH) employed to cleanse his society and succeeded in the first period Islam – and the rightly-guided Khalifas followed in the footsteps of the Prophet (PBUH).This is the practical way of implementing إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (49:10). There is no other way of sexual reformation.

Today this divine order has dissipated from our hearts. But its hazy imprint used to be there in our past society. When a stranger used to knock the door and a girl from the house opened the door then the girl used to tell her parents that a *brother* has come and is waiting at the door. While participating in any ceremony, girls used to tell their parents that that brother is misbehaving; or that this

brother is talking very nicely, etc…This kind of thoughts would become common in our current society as well provided we are able to differentiate between animal level life and human level life. In animal life there is no boundaries for satisfying sexual desires. In human level of life sexual desires must only be satisfied with in the boundaries set by the Quran. After understanding this fundamental difference between animal life and human life, if our youth are able to limit their sexual desires within these parametric thoughts advocated by the Quran, then the evil virus spreading in the current environment will not affect them. What will be the result of this change in thoughts, please don't ask me but ask Dr. Unwin who has ended his book as follows:

"In the future, it seems, a human society may continue its fortuitouscareer, and reflect, both in its cultural behaviour and in its structure, theamount of energy it chances to possess; but, if any society should desireto control its cultural destiny, it may do so by decreasing or increasingthe amount of its energy. Such decrease or increase will appear in thethird generation after the sexual opportunity has been extended or reduced.A lesser energy is easily secured, for the force of life seems to flow backwards,and the members of the society will not be slow to take advantageof any relaxation in the regulations. If, on the other hand, a vigoroussociety wishes to display its productive energy for a long time, and evenforever, it must re-create itself, I think, first, by placing the sexes on a levelof complete legal equality, and then by altering its economic and socialorganization in such a way as to render it both possible and tolerable forsexual opportunity to remain at a minimum for

an extended period, andeven forever. In such a case the face of the society would be set in theDirection of the Cultural Process; its inherited tradition would be continuallyenriched; it would achieve a higher culture than has yet been attained;by the action of human entropy its tradition would be augmented andrefined in a manner which surpasses our present understanding." [Page 432]

Do you notice what fundamental principle regarding sexual drive this investigative scholar has arrived at after detailed data analysis of numerous civilized and uncivilized societies? It is this principle:that equality between men and women must prevail; and that opportunity for sexual relationship must be reduced to the minimum possible. Fourteen hundred years ago, the Quran declared these restrictions essential: that no sexual relationship is allowed except strictly within the solemn contract of Nikah. And the Quran declared its every other formabsolutely haram.

قارئینِ طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 1000 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمایئے۔ شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999،
2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018۔










PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
08

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web: www.toluislam.org www.facebook.com/talueislam/

